www.shibliinternational.com

September 2020 ستمبر

ISSN: 2581-9216

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly SADA E SHIBLI Hyderabad

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

20/- روپے

Issue31 شمارہ_Vol:3 جلد

ستمبر: Sep :2020

ماہنامہ

حیدرآباد

صدائے شبلی

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی

پروفیسر مظفر علی شہہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی

پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،

ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی،

مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ

محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال

ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر سید امام

حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ

ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر مصطفیٰ خان، ڈاکٹر محمد فضیل ندوی،

ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان

قیمت فی شمارہ: 20

سالانہ: 220 -بیرونی ممالک: 50/امریکی ڈالر

خصوصی تعاون: 1000

MOHD MUHAMID HILAL
A/c: 52023475202 Bank: SBI
Ifsc: SBIN0020413
Micr: 500002311 Branch: Dabeerpura Hyd

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

Email: sadaeshibli@gmail.com

Mob: 9392533661 - 8317692718

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ (قسط:۲۸)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۷
۴	ایمان بالآخرت	مولانا صدرالدین اصلاحی	۱۱
۵	نئی نسل کا مستقبل تابناک کس طرح ہوسکتا ہے	مفتی امانت علی قاسمی	۱۳
۶	آزاد ہندستان اور بنیادی انسانی حقوق	ڈاکٹر آصف لئیق ندوی	۱۶
۷	غزل	خطیب رفعت اللہ	۱۹
۸	بابری مسجد کی کہانی بابری کی زبانی (نظم)	فضیل فوز	۱۹
۹	پیغام آفاقی کی افسانوی جہات	راحلہ پروین	۲۰
۱۰	تقدیر میں ہوتو.....(ناولٹ، قسط:۳)	سیدہ زہرا جبین	۲۵
۱۱	غزل	احمد علی برقی اعظمی	۲۹
۱۲	بین القصرین (عربی ناول) تجزیاتی مطالعہ کے آئینے میں	نواز احمد	۳۰
۱۳	غزل	سیدہ تبسم	۳۲
۱۴	کرنول کے نوابوں کی تاریخ کا ایک مختصر جائزہ	عائشہ جی بی	۳۳
۱۵	غزل	عبدالمنان صمدی	۳۶
۱۶	دلِ مردہ نہیں، اسے زندہ کردوبارہ	عبدالقوی ذکی حسامی	۳۷
۱۷	ڈراما علامہ تفہیم اقبالیات میں نیا اضافہ (تبصرہ)	ڈاکٹر جہاں نظیر	۴۰

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

ابو سفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی.....الحاج **محمد منیرالدین عرف ولی**، آغاپورہ حیدرآباد

ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد.....الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد

علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر).....**علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)

الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد.....**محمد عبدالماجد** ایڈوکیٹ، سکندرآباد، حیدرآباد

جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج

چارمینار، حیدرآباد.....مولانا **محمد عبدالقادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد۔

الحاج **محمد قمرالدین** نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

اپنی بات

اساتذہ قوم کے معمار ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اسی ماہ کی پانچ تاریخ کو ڈاکٹر سروے پلی رادھا کرشن کی تاریخ پیدائش کے موقع پر منایا جاتا ہے، لیکن اسی سال کرونا کی وجہ سے اساتذہ کی اعزازی تقریب پھیکی ہوگئی، مدارس اور اسکول کے بند ہونے کی وجہ سے اساتذہ بالخصوص پرائیویٹ ادارے میں کام کرنے والے اساتذہ جن مصائب وآلام سے گزر رہے ہیں، انہیں ضبط تحریر میں لانا مناسب نہیں ہے۔ البتہ حکومت اور ذمہ داروں کے اوپر فریضہ عائد ہوتا ہے کہ اس مقدس پیشہ کا خاص خیال رکھیں، کیونکہ انہیں سے ملک کے ہر شعبے میں افراد مہیا ہوتے ہیں۔ ہر شعبہ میں جانبین سے کمیاں اور کاہلی پائی جاتی ہے، اس کو دور کرنے کے لیے حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ عام طور پر دیکھا جارہا ہے کہ جو اساتذہ گورنمنٹ کی طرف سے مقرر ہوئے ہیں، ان میں بیشتر باصلاحیت ہوتے ہیں، ان میں جو کمیاں آئی ہیں، ایک تو اس وجہ سے کہ ان کا ضمیر مر چکا ہے۔ دوسرے ارباب کی بے توجہی ہے۔ کاش کہ سرکاری ادارے معیاری بن جائیں تو اس ملک اور عوام دونوں کے لیے مفید ہوں گے اور پرائیویٹ ادارے ان میں بیشتر تعلیمی ادارے ہی نہیں ہیں بلکہ فیکٹریاں ہیں۔ جس طرح اکثر مزدوروں کا استحصال اور ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی، ٹھیک اسی طرح اداروں میں اساتذہ کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ جب چاہیں بغیر عذر کے نکال دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال لاک ڈاؤن ہے، جس نے اس کاغذی پیرین کا بھی پردہ فاش کردیا ہے۔

ہمارے ملک کے دوایوان لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں جس طرح موجودہ حکومت بل پہ بل پاس کررہی ہے اور حزب مخالف کی کوئی رائے اور نہ پرواہ کررہی ہے، اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی جمہوریت کا تانا بانا الٹ پلٹ ہورہا ہے۔ اگر باشعور افراد نے اس مرحلے میں حکومت سے سوالات نہیں کیا تو کل اس ملک میں لاقانونی طاقت کا بول بالا ہوجائے گا اور پھر سوال کرنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈمی نے نئی نسل کی آبیاری کے لیے بطور تحفہ ''روشن ستارے'' کے نام سے اردو ماہنامہ کا باقاعدہ آغاز کردیا ہے۔ ادارہ صدر اکیڈمی مولانا رحیم الدین انصاری اور ڈائرکٹر مدیر ڈاکٹر غوث کی خدمت میں اس اہم کاوش پر مبارکبادی پیش کرتا ہے۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا ہے کہ اس کے تارے چمکتے ہی رہیں۔

محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

جود وسخا:

لوگوں کو عام حکم تھا کہ جو مسلمان مرجائے اور اپنے ذمہ قرض چھوڑ جائے تو مجھے اطلاع دو، میں اس کو ادا کروں گا اور جو ترکہ چھوڑ جائے وہ وارثوں کا حق ہے، مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔

ایک دفعہ آپؐ صحابہؓ کے مجمع میں تشریف فرما تھے، ایک بدو آیا اور آپؐ کی چادر کا گوشہ زور سے کھینچ کر بولا ''محمد! یہ مال نہ تیرا ہے، نہ تیرے باپ کا ہے، ایک بار شتر دے'' آپؐ نے اس کے اونٹ کو جو اور کھجوروں سے لدوا دیا۔

ایک دفعہ بحرین سے خراج آیا اور اس قدر کثیر رقم تھی کہ اس سے پہلے کبھی دارالسلام میں نہیں آئی تھی، آپؐ نے حکم دیا کہ اس کو صحن مسجد میں ڈالودو، اس کے بعد جب آپؐ مسجد میں تشریف لائے، تو اس پر مڑ کر بھی نظر نہ ڈالی، نماز سے فارغ ہو کر آپؐ نے اس کی تقسیم شروع کی، جو سامنے آتا اس کو دیتے چلے جاتے، حضرت عباسؓ کو جو غزوۂ بدر کے بعد دولت مند نہیں رہے تھے، اتنا دیا کہ اٹھ کر چل نہیں سکتے تھے، اسی طرح اور لوگوں کو بھی عنایت فرماتے تھے، جب کچھ نہ رہا تو کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اسلام میں قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی آزاد شدہ غلام مرجائے تو اس کا ترکہ اس کے آقا کو ملتا ہے، ایک دفعہ آپؐ کا اسی قسم کا ایک غلام مرگیا، لوگ اس کا متروکہ سامان اٹھا کر آپؐ کے پاس لائے، آپؐ نے دریافت فرمایا کہ کوئی اس کا یہاں ہم وطن ہے، لوگوں نے کہا ہاں ہے، آپؐ نے فرمایا یہ تمام چیزیں اسی کے حوالہ کردو۔

ایک دفعہ چند انصار نے آپؐ سے کچھ مانگا، آپؐ نے دے دیا، پھر مانگا، پھر دیا، پھر جب تک رہا آپؐ دیتے رہے، یہاں تک کہ آپؐ کے پاس کچھ نہیں رہا لیکن دوبارہ جو اس کے حاضر ہوئے اور درخواست کی، فرمایا میرے پاس جو کچھ ہو میں اس کو تم سے بچا کر نہیں رکھوں گا۔

ایثار:

آپؐ کے اخلاق وعادات میں جو وصف سب سے زیادہ نمایاں اور جس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا تھا، وہ ایثار تھا، اولاد سے آپؐ کو بے انتہا محبت تھی اور ان میں حضرت فاطمہؓ زہرا اس قدر عزیز تھیں کہ جب آتیں تو فرط محبت سے کھڑے ہوجاتے، پیشانی کو بوسہ دیتے اور اپنی جگہ بٹھاتے، تاہم حضرت فاطمہؓ کی عسرت اور تنگ دستی کا حال تھا کہ گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی، خود چکی پیستیں، خود ہی پانی کی مشک بھر لاتیں، چکی پیتے پیتے ہتھیلیاں گھس گئی تھیں اور مشک کے اثر سے سینہ پر نیل پڑ گئے تھے، ایک دن خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، خود تو پاس حیا سے عرض حال نہ کرسکیں، جناب امیرؓ نے ان کی طرف سے یہ حال عرض کیا اور درخواست کی کہ فلاں غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں، ان میں سے ایک کنیز مل جائے، آپؐ نے ارشاد فرمایا ابھی اصحاب صفہ کا انتظام نہیں ہوا اور جب تک ان کا بندوبست نہ ہولے میں اور طرف توجہ نہیں کرسکتا۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ 9838573645

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

پروفیسر شہریار

پروفیسر کنور محمد اخلاق شہریار (۱۹۳۶۔۲۰۱۲ء) مشہور شاعر تھے، مدۃ العمر دادِ سخن دیتے رہے، انھیں ڈاکٹر خلیق الرحمٰن اعظمی سے شرف تلمذ حاصل تھا، ان دونوں کی شاعری اور فکر وخیال سے اہل علم بخوبی واقف ہیں، پروفیسر شہریار مجلّہ فکر ونظر علی گڑھ کے مدیر رہے اور انھوں نے اس کے کئی اہم خصوصی شمارے شائع کئے جنھیں بڑی مقبولیت ملی، اسی سلسلہ کی ایک کڑی فکر ونظر کا شبلی نمبر بھی جو جون ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ پروفیسر شہریار نے اس کا جو اداریہ لکھا ہے اور جس میں انھوں نے فکر ونظر کی خصوصی اشاعتوں کا ذکر کیا ہے اور پھر شبلی نمبر نکالنے کا سبب بھی بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ علی گڑھ نے شبلی کو ہمیشہ اپنے معماروں میں شمار کیا ہے۔

شبلی ۱۶ر برس علی گڑھ کالج اور دامن سرسید سے وابستہ رہے، سرسید سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا اور خود انھوں نے کالج کو اپنی علمی سرگرمیوں سے بہت کچھ فائدہ بھی پہونچایا، باوجود اس کے انھوں نے سرسید کے بعض نقطہ نظر سے ان کی زندگی میں اور ان کے سامنے اختلاف کیا، اختلاف رائے کا سرسید سے زیادہ احترام کرنے والا مسلمانوں میں اب شاید ہی کوئی پیدا ہو، انھوں نے تو اس کے خلاف کچھ نہ کہا مگر بعد کے لوگوں نے اس کو ہوا دی اور شبلی کو علی گڑھ ہی کا مخالف قرار دے دیا، جس کے نتیجے میں بعض بڑی غلط باتیں کی گئیں، پروفیسر شہریار نے اس کا ذکر بڑے خوب صورت انداز میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''سرسید نے اے ایم او کالج میں جن بڑے دانشوروں کو جمع کیا تھا ان میں شبلی کا نام بہت اہم ہے، وہ لمبے عرصہ تک علی گڑھ سے وابستہ رہے، ان کے تخلیقی اور ادبی زندگی کا یہ سنہرا دور ہے، اس کا اظہار انھوں نے جگہ جگہ کیا ہے۔ ان کی ایک دورایوں کو نام نہاد سرسید پرستوں نے اتنی ہوا دی کہ عام لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ شبلی سرسید اور علی گڑھ تحریک کے مخالف تھے۔ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی یہ ایسی مثالیں ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سرسید کے تمام رفقا جہاں سرسید کی تحریک کے بنیادی تصورات سے اتفاق کرتے تھے وہیں ان کی تعبیر وتشریح اور ان کے علمی نقاط میں سرسید سے ان کو ضمنی اختلاف بھی تھا۔ سوچنے والے ذہنوں میں اس نوع کے اختلافات نہ ہوں تو حیرت کی بات ہے۔ سرسید اور شبلی کے درمیان فاصلے پیدا کرنے والوں میں ان لوگوں کی اکثریت ہے جو اس دور میں ہوتے تو یا سرسید کے خلاف ہوتے یا شبلی کے''۔ (فکر ونظر علی گڑھ جون ۱۹۹۶ء ص ۵۔۶)

پروفیسر فتح محمد ملک

ممتاز محقق ومصنف اور نقاد پروفیسر فتح محمد ملک (پ:۱۸ر جون ۱۹۳۶ء) نے اختر وقار عظیم کی کتاب ''شبلی بحیثیت سیاست داں'' پر پیش لفظ لکھا ہے۔ اختر وقار عظیم شبلی کے شیدائی ہیں، اس

سے پہلے انھوں نے ایک عمدہ کتاب ''شبلی بحیثیت مورخ'' لکھی تھی جو بے حد مقبول ہوئی، اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا بعد ازاں ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۸ء اور ۲۰۰۵ء میں اس کے ایڈیشن شائع ہوئے، ان کی دوسری کتاب ''شبلی بحیثیت سیاست داں'' ۲۰۱۶ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ یہ مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ ان کے چند مضامین کا مجموعہ ہے۔

پروفیسر فتح محمد ملک نے سرسید تحریک سے شبلی کے جزئی اختلاف اور جزئی اتفاق کی توجیہ اس طرح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سرسید احمد خاں کے رفقا میں مولانا شبلی نعمانی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے سرسید کی اصلاحی تحریک کے اغراض ومقاصد کی تخلیقی انداز میں تکمیل کی مساعی کو قومی وملی احیا کے لئے کافی نہیں جانا بلکہ ان اصلاحی اور تعمیری مقاصد کو ارتقائی نقطہ نظر سے دیکھا، سمجھا اور علم وعمل میں ڈھالا۔

مولانا شبلی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۸۵۷ء وہ سال ہے جب سرسید احمد خاں بلوغت کے تمام مراحل طے کرنے کے بعد اپنی اصلاحی تحریک کی بنیادیں استوار کرنے میں کوشاں ہو چکے تھے۔ مولانا شبلی کا تعلق اگلی نسل سے تھا، اس لئے انھوں نے سرسید کی تعلیمی، ادبی اور دینی اصلاح کے پروگرام پر عمل بھی کیا اور پھر اسی تحریک کے ارتقائی تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے اسے انجماد سے بچانے کی خاطر نئی اور سامراج مخالف حکمت عملی کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے''۔ (شبلی بحیثیت سیاست داں ص ۱۰)

پروفیسر فتح محمد ملک کا یہ بھی خیال ہے کہ مولانا شبلی نے عاشقانہ شاعری کا نایاب باب قلم بند کیا اور یہ کہ اگر وہ قومی ضروریات کو مقدم نہ خیال کرتے تو یقینی طور پر عشقیہ شاعری میں سنگ میل قائم کر جاتے، قومی ضروریات پر انھوں نے اپنی پسند کو پس پشت ڈالا اور بجائے شاعر کے مورخ بن کر سامنے آئے۔

ان کا خیال ہے کہ مشنریوں کے اس پروپیگنڈہ سے کہ مسلمانوں کو علم ودانش سے کوئی سروکار نہیں رہا ہے، متاثر ہو کر انھوں نے المامون لکھی، اسی طرح انگریزوں کے اس ناروا الزام سے کہ مسلمان حکمرانی سے ناواقف ہیں، اس کے جواب میں الفاروق سپرد قلم کی۔ اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

پروفیسر فتح محمد ملک نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ سرسید کے برعکس شبلی نے مصر وشام کا سفر کیا جہاں سید جمال الدین افغانی کے فیضان کو عام کرنے کے لئے مفتی محمد عبدہ اور شیخ رشید رضا جیسے جدیدیت پسند علما سرگرم تھے۔ ان کے روابط نے شبلی کے سیاسی شعور کو ایک انقلابی رخ عطا کیا۔ وہ اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ شبلی کانگریس کے زیادہ قریب تھے اور مسلم لیگ کو ناپسند کرتے تھے، ان کی دلیل یہ ہے کہ عہد شبلی میں کانگریس اور مسلم لیگ میں زیادہ فرق نہیں تھا اور دونوں جماعتوں کے وابستگان ایک دوسری جماعت میں آتے جاتے رہتے تھے اور بعض اوقات دونوں کے مشترکہ اجلاس بھی ہوئے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ شبلی نے مسلم لیگ پر جو تنقیدیں وہ دراصل اس کی اصلاح چاہتے تھے۔

پروفیسر فتح محمد ملک کا مطالعہ شبلی واجبی سا ہے، انھوں نے اپنے موقف کی تائید میں جو اقتباسات نقل کئے ہیں وہ تمام تر اختر وقار عظیم کی کتاب شبلی بحیثیت مورخ سے لئے گئے ہیں، اسی طرح جہاں انھوں نے ندوہ کا ذکر کیا ہے اسے ندوۃ المصنفین لکھا ہے۔ یہ ایسی غلطی ہے کہ ندوہ اور دار المصنفین دونوں پر منطبق ہو سکتی ہے، ایک جگہ تو صراحت سے اعظم گڑھ

بھی لکھ دیا ہے۔

مولانا شبلی کا سیاسی نقطہ نظر بالکل واضح ہے، وہ مسلم لیگ کو سخت ناپسند کرتے تھے، ان کی نظمیں اس کی شاہد ہیں اور وہ کانگریس کو دل سے پسند کرتے تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست علمبردار تھے، جو لوگ اس موضوع پر ان کے خیالات سے واقفیت چاہتے ہیں انھیں ان کا طویل مقالہ ''مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ'' کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر ابرار اعظمی

ڈاکٹر ابرار اعظمی (پ: ۱۹۳۶ء) ادیب اور شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں، اصلاً تعلیم ان کا میدان رہا ہے، مذہب سے بھی لگاؤ ہے، ان تینوں موضوعات پر ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان کے کلام کا انتخاب غبار شیشۂ ساعت عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے۔ ان کا ذکر میری کتاب شبلی سخنوروں میں آچکا ہے، انھوں نے کئی نثری تحریروں میں علامہ شبلی کے کمالات کا اعتراف کیا ہے، انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک نظم بھی کہی ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی شبلی کے ارشد تلامذہ میں ہیں، ان پر مرحوم ہارون اعظمی صاحب نے سمینار منعقد کیا تو ابرار اعظمی صاحب بھی شریک ہوئے، اور ایک تحریر بھی پڑھ کر سنائی اسے مجموعہ مقالات سمینار ''مولانا عبدالسلام ندوی کی دانشوری اور عصر حاضر'' میں بطور تبریک شامل کیا گیا ہے، اس میں انھوں نے مولانا عبدالسلام ندوی کی کاوشوں میں روح شبلی کی نشاندہی کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا (عبد السلام ندوی) کی گراں قدر تصانیف میں پائی جانے والی ایک زیریں لہر کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ ہے اپنے عبقری استاذ علامہ شبلی نعمانی کی فکر ونظر میں ترویج وتوسیع۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسی غیر معمولی تصنیف کی توسیع تو خارج از امکان ہے مگر بعد از نبی بزرگ تر یعنی صحابہ کرام کی سوانح نگاری کی بنا بھی علامہ نے الفاروق لکھ کر ڈالی تھی، مولانا نے سیرت عمر بن عبد العزیز اور اسوہ صحابہ اور اسوۂ صحابیات لکھ کر مقصد کو آگے بڑھایا۔ علامہ نے الغزالی تحریر فرمائی تھی، مولانا نے امام رازی اور حکمائے اسلام لکھ کر اس سلسلے کو وسعت دی۔ علامہ نے پانچ جلدوں میں شعر العجم تصنیف کی اور مولانا نے دو جلدوں میں شعر الہند لکھ کر تذکراتی ادب میں مؤقر اضافہ کیا۔ علامہ نے نظریاتی اور عملی تنقید کا معیاری نمونہ موازنہ انیس ودبیر میں پیش کیا اور مولانا نے اقبال کامل میں، اقبال شاعر پہلے تھے اور بعد میں کچھ اور والی بات کہہ کر ایک نمایاں ادبی خدمت انجام دی۔ علامہ کی سیرۃ النعمان اور مولانا کی تاریخ فقہ اسلامی (ترجمہ) کو بھی اسی پس منظر میں دیکھا جانا چاہئے۔ بہ الفاظ دیگر مولانا عبدالسلام ندوی کی دانشوری کا تذکرہ ہو تو اس آفتاب علم وادب کا ذکر خیر ناگزیر ہو جاتا ہے جس سے مولانا نے کسب نور کیا''۔ (مولانا عبدالسلام کی دانشوری اور عصر حاضر، ص ۱۱۔۱۲)

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

مولانا ضیاء الدین اصلاحی (۱۹۳۷-۲۰۰۸ء) ممتاز اہل قلم اور ادیب وانشا پرداز تھے، بڑی خوبصورت نثر لکھتے تھے، دار المصنفین سے پچاس برس وابستہ رہے، بیس سال تک اس کی نظامت کے فرائض انجام دیئے، متعدد کتابیں سپرد قلم کیں اور مختلف موضوعات پر سیکڑوں مضامین لکھے، انھیں علامہ شبلی سے خاص عقیدت تھی، دار المصنفین کے اہل قلم میں سید صاحب کے

بعد سب سے زیادہ انھیں نے شبلی پر قلم اٹھایا ہے، ان کے ان مضامین ومقالات کو جو علامہ شبلی سے متعلق تھے عظمت شبلی کے نام سے ڈاکٹر اورنگزیب اعظمی نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔

ضیاء الدین صاحب مرحوم کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے علامہ شبلی کی وہ کتابیں جو دار المصنفین سے شائع نہیں ہوئی تھیں یا شائع ہوئی تھیں مگر آوٹ آف پرنٹ تھیں ایک ایک کو شائع کیا اور جو شائع شدہ تھیں انھیں ایڈٹ کرا کے اس کے نئے خوب صورت ایڈیشن شائع کئے اور ان پر بڑے خوب صورت دیباچے لکھے، اس کے علاوہ بعض دوسرے اہل قلم جنھوں نے علامہ شبلی پر کتابیں لکھیں ان پر بھی دیباچے لکھے ہیں، یہاں ان کے چند دیباچوں اور ان کے مشمولات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

انھوں نے سب سے پہلے سیرۃ النبیؐ کا ایک محقق ایڈیشن تیار کرایا اور اپنے مختصر دیباچے کے ساتھ شائع کیا اور لکھا کہ:

''سیرۃ النبیؐ دار المصنفین شبلی اکیڈمی کی سب سے مقدس ومقبول کتاب ہے، اردو تو کیا عربی میں بھی اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی، اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

تقریباً ایک صدی پہلے جب علامہ شبلی نے اس مبارک کتاب کی تالیف کا آغاز کیا تھا تو ان کی زندگی کی شام ہو چکی تھی اور وہ اس کے دو حصے ہی لکھ سکے تھے کہ پیام اجل آ گیا، ان حصوں کی اشاعت اور علامہ شبلی کے تیار کردہ خاکہ کے مطابق بقیہ حصوں کی ترتیب وتالیف کی سعادت ان کے عزیز شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی کے حصے میں آئی، رحمہ اللہ تعالیٰ''۔(سیرۃ النبی ج ا ص ا)

اس کے بعد سیرت کے اس نئے ایڈیشن کی تحقیق وتخریج اور حوالوں کا اہتمام اور تصحیحات وغیرہ کی تفصیل ہے اور بتایا ہے کہ یہ کام سید صاحب نے دوبار انجام دیا اور یہ تیسری کی کوشش ہے، اس لحاظ سے یہ سب سے اہم ایڈیشن ہے، اس وقت یہی محقق ایڈیشن دار المصنفین مستقل شائع کر رہا ہے، بلا شبہہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کی یہ ایک اہم کوشش تھی۔

مولانا اصلاحی نے علامہ شبلی کی مقبول ترین کتاب موازنہ انیس ودبیر کا بھی محقق ایڈیشن شائع کیا ہے، اس پر جو دیباچہ لکھا ہے اس سے ان کی اردو ادب پر گہری نگاہ کا اندازہ ہوتا ہے، اس دیباچے کے دو اقتباس نقل کئے جاتے ہیں، موازنہ انیس ودبیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''موازنہ انیس ودبیر مولانا شبلی کی مقبول ترین اور کلاسیکل اردو ادب کی بلند پایہ کتاب ہے، اس میں مصنف نے دکھایا ہے کہ کم مائیگی زبان کے باوجود اردو شاعری عظمت اور بلند پائیگی کی حامل ہے۔ اس مقصد سے اردو کے بہت ہی ممتاز شاعر میر انیس کا انتخاب کر کے ان کے کلام کی خوبیاں اور خصوصیات دکھائی ہیں اور بتایا ہے کہ میر صاحب کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں وہ اردو کے کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ہیں، میر انیس کے کمالات اور شاعری کے محاسن دکھانے اور فنی کمال کو نمایاں کرنے کے لئے مولانا نے کتاب کے ایک باب میں مرزا دبیر سے ان کا موازنہ بھی کیا ہے جو اس وقت تو ایک ناخوش گوار بحث کا باعث بن گیا تھا لیکن اب مولانا شبلی کی رائے کی صحت عموماً تسلیم کر لی گئی ہے''۔

(موازنہ انیس ودبیر ص ۱۰۔۱۱)

مولانا صدرالدین اصلاحی (حیدرآباد)

ایمان بالآخرت

مومن ہمیشہ آخرت کو دنیا پر مقدم رکھتا ہے، لیکن منکر دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے اور یہ دراصل مرغوباتِ نفس اور مفاد دنیا کی غیر معمولی کشش ہوتی ہے جو اس کو امورِ آخرت کی طرف سنجیدگی کے ساتھ متوجہ نہیں ہونے دیتی، اس لئے اگر آپ کو امت کے ایمان بالآخرت کی مجموعی کیفیت کا اندازہ لگانا ہو تو اس کی کسوٹی کو بھی لے کر چاروں طرف گھوم آیئے، پھر آپ کو اپنے تجربہ اور احساس کی تلخی کا شکوہ تو ضرور ہوگا، مگر اس جائزہ میں تعدی کی شکایت غالبًا باقی نہ رہے گی جو ابھی ہم نے لیا ہے۔

اس صورتحال پر کون صاحبِ دل ہوگا جو بے چین نہ ہو جائے گا اور جب وہ ساتھ ہی یہ بھی دیکھے گا کہ اہل قرآن نے ان تیز وتند تنقید سے کوئی خاص سبق نہیں سیکھا جو قرآن نے اہل تورات کے افکار و اعمال پر کی تھیں، تو اس کی اس بے چینی کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے! بنی اسرائیل نے اپنی نجات کا جو "فارمولا" ایجاد کر رکھا تھا اس کی تردید میں قرآن نے کوئی ابہام نہیں رہنے دیا تھا اور صاف فرما دیا تھا کہ یہ نظریات تورات اور انجیل کے پیش کردہ نظریات کب ہیں! یہ تو تمہاری آرزوؤں کے بطن سے نکلے ہوئے اوہام ہیں، جن کی حیثیت سراب سے زیادہ نہیں۔ دنیا و آخرت کی بہبودیاں ان اوہام اور امانی پر ہرگز منحصر نہیں، بلکہ ان کا انحصار تمام تر ایمان اور اعمال صالحہ پر ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کے یہاں فلاح و بخشش کا ایک متعین ضابطہ ہے، اگر اپنے فریبِ نفس کے چکر میں پڑ کر تم نے اس ضابطۂ عدل کو معدوم سمجھ لیا تو اس سے واقعتہً وہ معدوم نہیں ہو جائے گا، اس لئے اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو اس چکر سے نکلو اور حقیقت کا مقابلہ کرو۔ یہ فہمائشیں آج بھی قرآن کے صفحوں میں درج ہیں، اور ان کی روز ہی تلاوت کرتے ہیں مگر افسوس، ہم انہیں اور انہیں کی طرح دوسری فہمائشوں اور تنقیدوں کو اس طرح پڑھتے ہیں، جس طرح کسی غیر شخص کی فرد قرارداد جرم اور اس کے مقدمے کی روداد کا مطالعہ کیا جاتا ہے، گویا ان سے ہماری دلچسپی محض تاریخی واقفیت کی حد تک ہے، ورنہ فی الواقعہ اس ساری داستان میں ہمارے اپنے لئے کوئی سامانِ عبرت و نصیحت نہیں۔ یہ اندازِ فکر و نظر بجائے خود کتنا غلط اور ناعاقبت اندیشہ نہ تھا، مگر ماتم تو اس بات کا ہے کہ یہ اندازِ فکر اس حال میں اختیار کیا گیا، جبکہ پہلے ہی سے ہمیں اس کے خلاف متنبہ بھی کیا جا چکا تھا، ذرا اس تردید کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے جو اہل تورات کے خود ساختہ نظریہ کی بابت کی گئی تھی۔ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَ لَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ .... مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِن ذكر او انثىٰ وهو مومن فاولٰئك يدخلون الجنة (النساء۱۲۳،۱۲۴)" (مسلمانوں) فلاح و بخشش نہ تمہاری خواہشوں پر موقوف ہے نہ ہی ان اہل کتاب کی خواہشوں پر، ہمارے یہاں تو جو شخص جو برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا .... اور جو کوئی بھی اچھے عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، لیکن ہو وہ صاحبِ ایمان وہ جنت میں داخل ہوگا" ان الذین امنو و الذین هادو و النصٰرىٰ و الصٰبئين من آمَنَ باالله و اليوم الآخر و عمل صالحاًفلهم اجرهم عند ربهم (بقرہ۶۲)" بلا شبہ چاہے مسلمانوں کا گروہ ہو چاہے یہودیوں کا، نصاریٰ ہوں خواہ صابئین، ان میں جو شخص بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے گا اور صالح اعمال کرے گا تو اس کے لئے اس کے رب کے پاس اجر و (بخشش) ہے" کیا ان آیتوں میں صرف اہل کتاب ہی مخاطب ہیں اور محض ان ہی کو یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ انسان کی نجات کا انحصار اس کی اپنی خواہشوں کے گھڑے ہوئے تصوّرات پر نہیں ہے، بلکہ توحید و آخرت کے سچے یقین پر، اور اس اصلاح عمل پر ہے جو اس یقین کی تہوں سے خود بخود

ابھرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ اس کے برخلاف آپ دیکھ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا ضابطہء عدل اور دستورِ مغفرت بیان کرتے وقت خود مسلمانوں کا نام سب سے پہلے لیا ہے، اور یہ ہمارے مہربان پروردگار کی کتنی بڑی کرم فرمائی تھی کہ اس نے اس امّت کے لئے پہلے ہی سے وہ چور دروازہ بند کر دیا تھا، جس میں سے ہو کر پچھلی امتوں پر گمراہی، بت پرستی ،خواہش پرستی ،شریعتِ الٰہی سے بے توجہی ، احکامِ دین سے سرتابی اور اندیشہء آخرت سے بے نیازی کے فتنے ٹوٹ پڑے تھے، اور باوجود اس کے کہ اس دور میں مسلمانوں کے دل و دماغ اس گمراہ کن وہم کا کوئی ہلکے سے ہلکا اثر بھی اپنے اندر نہیں رکھتے تھے، مگر چونکہ انسانی نفسیات کے مدنظر آئندہ اسکا خطرہ بہرحال تھا، اس لئے اللہ عزّ وجلّ نے پیش بندی کے طور پر انہیں بھی متنبہ فرما دیا اور صرف اتنا ہی کہ دینے پر اس نے اکتفا نہ کر لی کہ اہلِ کتاب اپنی بابت جو صورتِ نجات رکھتے ہیں وہ غلط ہے، بلکہ مسلمانوں کا شانہ پکڑ کر انہیں براہِ راست بھی یہ حقیقت سمجھا دی گئی کہ ''جس طرح مدارِ نجات یہودیت یا نصرایت یا صابیت نہیں ہے، اسی طرح ''مسلمانیت'' بھی نہیں ہے، اس لئے ہوشیار رہنا اور ان یہودیوں کی طرح کبھی تم بھی اس غلط فہمی کا شکار نہ بن جانا کہ ہمارا حلقہء ملّی حلقہء نجات ہے، اس میں داخل ہو جانا ہی حسنِ عاقبت کی گیارنٹی ہے، ورنہ جس طرح اس خوش گمانی نے آج ان یہود و نصاریٰ کو ڈبو رکھا ہے، اسی طرح کل تمہیں بھی لے ڈوبے گی'' مگر انصاف سے کہیئے ہم نے اس زبردست تنبیہ کا کہاں تک پاس رکھا؟ واقعات کی شہادت جو کچھ ہے وہ تو یہ کہتی ہے کہ ہم نے اس سلسلہ میں سخت خطرناک غفلتوں کا ثبوت دیا ہے، اور قرآن نے ہمارے ایمان و عمل کے بچاؤ کے لئے جو بند باندھا رکھا تھا، اسے اپنے کارخانہء منطق و کلام کی ڈھلی ہوئی گولیوں سے چھلنی کر ڈالنے کی کوششوں سے باز رہنے کی طرف ہم نے کم ہی توجہ کی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ امت بھی اندیشہء عاقبت سے بے نیازی کے فتنوں سے محفوظ نہ رہ سکی اور انجام کار آج اس کے اندر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت دونوں کی جڑیں ہل چکی ہیں، اور جب ایسا ہو چکا تو تعجب نہ کرنا چاہیئے، اگر اس سے تقویٰ کی اہمیت رخصت ہو چکی ہو، اگر اسے اپنا مقصدِ حیات فراموش ہو چکا ہو، اگر اس کے دماغ سے حق کے لئے جینے اور حق ہی کے لئے مرنے کا سودا نکل چکا ہو۔

اس صورتحال پر ہم جتنا بھی زیادہ غور کرتے ہیں، اتنا ہی زیادہ ہمیں یقین ہوتا جاتا ہے کہ ہمارے اندر دونوں بنیادی ایمانیات متزلزل ہو چکے ہیں، مگر ایمان بالآخرت پر ہماری غفلتوں نے زیادہ توجہ کی ہے، ایمان باللہ کا وجود ابھی اس حد تک ناپید نہیں، جس قدر کہ ایمان بالآخرت کا ۔بحیثیت مجموعی اگر امّت کے ایمان باللہ کو خفتہ اور مضمحل کہا جائے تو اس کے ایمان بالآخرت کی اہمیت کو بے حس اور مفلوج کہنا چاہیئے ۔اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ پچھلی تمام امتوں میں یہی کچھ صورتحال دکھائی دے رہی ہے۔ ہم قرآن میں جس قوم کا تذکرہ بھی پڑھتے ہیں، اس کو اللہ کا انکار کرتے ہوئے تو نہیں پاتے، مگر قیامت کے معاملہ میں قریب قریب ہر قوم کی طرف سے اسی نوع کی حیرت کا اظہار دیکھتے ہیں کہ ء انا لمردودون فی الحافرة ، ء اذا کنا عظاما نخرة (النّٰزعات) ''کیا ہم (مرنے کے بعد زندگی کی) پہلی حالت میں پھر لوٹائے جائیں گے؟ کیا (یہ اس وقت ہوگا) جبکہ ہم گلی سڑی ہڈیاں ہو جائیں گے؟ اور اگر بعض اقوام ایسی نکلی بھی کہ انہوں نے قیامت کا اس جزم کے ساتھ انکار نہیں کیا تو ان کا قیامت کو ماننا بھی اس اندازہ کا تھا کہ عمل اور نتیجہ کے اعتبار سے وہ نہ ماننے کے ہی مترادف تھا۔ اب جب یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ ہر پیغمبر نے اپنی قوم کے دل و دماغ میں ایمان باللہ اور ایمان باالآخرت دونوں کی جڑیں جمانے کی ابتداء ہی سے کوشش کی اور آخر دم تک وہ ان جڑوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا رہا، کیونکہ یہی دونوں ایمانیات دینِ حق کے اصلی سنگ ہائے بنیاد ہیں، تو آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ پیغمبر کے جانے کے بعد جب اس کے پیروؤں میں گمراہی نے اپنا سر نکالا تو اس کا اولین ہدف ایمان بالآخرت ہی بنا؟ ایمان باللہ کا تو کلی استیصال اس نے کبھی نہیں کیا، مگر ایمان بالآخرت کے بارے میں اس نے اس وقت تک اطمینان کا سانس نہیں لیا، جب تک کہ لوگوں کے دماغ کے ایک ایک ریشے سے اس کے امکان کے تصوّر کو جڑ بنیاد سے کھود کر پھینک نہ دیا؟

مفتی امانت علی قاسمی۔استاذ ومفتی دارالعلوم وقف دیوبند

نئی نسل کا مستقبل تابناک کس طرح ہوسکتا ہے؟

ملک کا موجودہ منظر نامہ کسی باشعور شہری سے مخفی نہیں ہے ، چند دنوں قبل نئی تعلیمی پالیسی کا خاکہ منظر عام پر آچکا ہے،اس کے اثرات کیا ہوں گے اور مسلم بچوں کے عقیدہ و ایمان کے ساتھ ان کے مستقبل کو کیا خطرات لاحق ہوسکتے ہیں اس پر گفتگو ہورہی ہے۔تعلیم ایک ایسا راستہ اور طریقہ عمل ہے جس کے ذریعہ قوموں کے افکار ونظریات کو تبدیل کیا جاسکتا ہے، ماضی میں بھی انگریزوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اسی تعلیمی ہتھیار کا استعمال کیا تھا۔

نئی تعلیمی پالیسی میں ویدانتا کے جن اصولوں کو نافذ کرنے کی بات کہی گئی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت بلا کسی قانون کے ہی یکساں سول کوڈ کے منصوبے کی تکمیل کرلے گی اور یکساں سول کوڈ صرف ایک سیاسی پینترہ رہ جائے گا۔اس لیے کہ اس میں زبان،تہذیب اور لباس ہر طرح کی یکسانیت کی بات کہی گئی ہے،اور ہر بچے کو لازمی اسکولی تعلیم کے ذریعہ اس کے فکر وتہذیب اور عقیدہ وعمل پر شب خون مارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان حالات میں مسلم بچوں کا مستقبل یقیناً خطرات کی زد میں ہے اور یہ ایک طویل منصوبہ ہے جسے روبعمل لانے کی پوری کوشش ہورہی ہے ۔عصری تعلیمی نظام کس حد تک مہلک ہے اور ایمان وعقائد کو کس حد تک متاثر کرتے ہیں اس سلسلے میں مولانا گیلانیؒ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں ۔مولانا گیلانیؒ ایک طویل تعلیمی تجربہ رکھتے تھے، عصری اور دینی دونوں اداروں سے وابستہ تھے،اور علم وادب کے میدان میں بلند پایہ ہونے کے ساتھ قوت استدلال اور نتیجہ اخذ کرنے کے سلسلے میں ان کو کمال حاصل تھا،ہندوستان کے نظام تعلیم وتربیت پر ان کی دوجلدوں میں ضخیم کتاب ہے۔مولانا گیلانیؒ عصری تعلیمی اداروں کے نقصانات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے برخاست ہوجانے کے بعد حکومت مسلطہ نے تعلیم کا جو نظام ملک میں (اسکولوں اور کالجوں غیرہ کے نام سے قائم کیا مشاہدہ بتارہا ہے کہ اس نظام کی تعلیم سے استفادہ کرنے والے مسلمانوں میں بتدریج اسلامی زندگی سے بُعد پیدا ہوتا چلا جارہا ہے، یہ واقعہ ہے کہ جن خاندانوں میں جدید تعلیم تیسری اور چوتھی پشت میں اس وقت تک پہنچ چکی ہے ان میں اسلام کا صرف نام رہ گیا ہے، عام ابتدائی باتیں بھی ان لوگوں کو اسلام کی معلوم نہیں، یہ سنی ہوئی نہیں دیکھی ہوئی بات ہے کہ اچھے لکھے پڑھے لوگ جن کا نام بھی مسلمان کا ساتھا لیکن وہ اپنے پیغمبر ﷺ کی شخصیت تک سے ناواقف نظر آئے ظاہر ہے کہ اپنے دین سے جو اس حد تک دور ہوچکا ہو وہ دین کی دوسری باتوں سے کس حد تک واقف رہ سکتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ جیسے جیسے دن گزرتے جاتے ہیں اس قوم کے نام نہاد مسلمانوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی جارہی ہے اور حالات میں کوئی تغیر اگر خدانخواستہ واقع نہ ہوتو یوں ہی یہ تعداد اور بڑھتی چلی جائے گی۔

(۲) حکومت کا میلان عموماً تعلیم کے لزوم کی طرف بڑھتا چلا جارہا ہے اس وقت تک تو تعلیم کے دائرے کو وسیع ہی کرنے پر حکومت قناعت کررہی ہے لیکن وہ دن دور نہیں ہے کہ ملک کے ہر باشندے کو مجبور کیا جائے گا کہ حکومت کے منظورہ نصاب کی تعلیم لزوماً اپنے بچے اور بچیوں کو دلائے جس کے معنی یہی ہوسکتے ہیں کہ عام مسلمانوں کو تھوڑا سا تعلق اسلام سے ابھی

جو باقی ہے، تعلیم کی وسعت اور اس کا لزوم اس تعلق کو بھی کمزور کرتا چلا جائے گا، تعلیم یافتہ طبقہ سے مایوس ہو کر علماء اسلام جن عام مسلمانوں کی دینی عقیدت پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں اس عقیدت کی عمر بھی زیادہ دراز نظر نہیں آتی۔

(۳) مذہب کے خلاف ہر زمانہ میں مختلف تحریکیں مختلف بھیسوں میں رونما ہوتی رہی ہیں ان تحریکوں کا مقابلہ ہر زمانہ کے علماء نے ان تحریکوں کی گہرائیوں تک خود پہونچنے کے بعد کیا ہے اور ہے بھی یہی بات کہ مرض کا علاج مرض کے صحیح واقفیت کے بعد ہی ممکن ہے؛ لیکن مرض کو مرض جیسی ناپاک چیز قرار دے کر اگر طبیب اس کے جاننے سے گریز کرلے گا تو مریضوں کا علاج ہو چکا۔ (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت ۲/۴۰۱)

مولانا گیلانی کی باتوں کو بار بار غور سے پڑھیے، آج سے قریب ستر سال پہلے آزاد ہندوستان کے نظام تعلیم کے ابتدائی ڈھانچے سے ہی انہوں نے ان خطرات کا ادارک کرلیا تھا، کہ ہر شخص اور ہر شہری کے لیے سرکاری تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے گا اور بالآخر ۲۰۰۹ء میں یہ قانون بن ہی گیا کہ ہر بچے کو سرکاری تعلیم حاصل کرنا ضروری ہوگا، اس سے آپ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ کس طرح مسلم بچوں کا ایمان اور اس کا مستقل خطرات کی زد میں ہے۔

ایسے حالات میں کس طرح کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جائے کہ مسلم بچوں کا مستقبل تابناک ہو، عصری تعلیمی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ان کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت کی جاسکے، تعلیم کے نام پر بھگوا کرن کرنے اور ہر ہندوستانی کو ایک رنگ میں رنگ کر مسلمانوں کو اسلامی تہذیب وثقافت سے دور کرنے کی جو کوشش کی جارہی ہے اس کا مقابلہ کس طرح کیا جائے اور کس طرح اسلامی ثقافت کا فروغ اور تحفظ کیا جاسکے؟ اس سلسلے میں چند باتیں قابل توجہ ہیں ان پر عمل کر کے ممکن ہے کہ کسی حد تک نئی نسل کے تابناک مستقبل کا خواب تعمیر کیا جاسکے۔

(۱) اسکول میں تعلیم پانے والے ہر بچے کے لیے دینیات کے نظام کو یقینی بنایا جائے، اور کوشش کی جائے کہ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے والا خاص کر انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم پانے والا ہر بچہ مکتب کے نظام سے جڑے اور تین چار سال صرف ایک گھنٹے کے ذریعہ ان بچوں کو اسلام کے لازمی عقائد کی تعلیم دے دی جائے، عبادات کی اہمیت، ایمان کی عظمت، کفر وشرک کی قباحت اور اس سے نفرت ان کے دلوں میں جاگزیں کردیا جائے، اسلامی تاریخ کے روشن عنوانات سے ان کو واقف کرایا جائے، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی زندگی کے مختصر حالات، آپ ﷺ کی زندگی کے اہم پہلو، سلاطین ہند کے مختصر واقعات اور اسلامی تہذیب کی ضرورت واہمیت جیسے عنوانات سے متعارف کرا کر ان کے دل کی سادہ تختی کو ان چیزوں سے اس طرح پُر کردیا جائے کہ دنیا کی کسی غلیظ اور مکروہ تربیت کے لیے ان بچوں کے لوح دل پر کوئی جگہ باقی نہ رہے۔

(۲) اسکول میں تعلیم پانے والے بڑے بچے، اسی طرح کالج میں تعلیم حاصل کرنے والے لڑکے اور لڑکیوں کے لیے مختصر اسلامیات کا کورس مرتب کیا جائے اور یہ بچے جہاں ٹیوشن پڑھتے ہیں وہیں پر یا کہیں اور مناسب جگہ حاصل کر کے اتوار کو ایک کلاس اسلامیات کی کرائی جائے جن میں اسلام کی اہم تعلیمات اسلام کے بنیادی عقائد، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کے جملہ مسائل، اسی طرح نکاح و طلاق، وقف، معاملات، اخلاقیات، میراث وغیرہ مسائل کی اجمالی اور ضروری تعلیم دی جائے۔ ایک سال پر یہ کورس محیط ہو جس میں سبق کی طرح بچوں کو پڑھایا جائے جلسے کی طرح بیانات نہ کرائے جائیں، اور سال میں اس کا ایک امتحان لے کر مختصر اسلامیات کورس کا ان کو سرٹیفکٹ دیا جائے اس سے مسلم بچوں میں اسلام کے ضروری تعلیمات سے واقفیت ہوگی، اور اسلام کے تئیں ان میں بیداری پیدا ہوگی

۔دیکھنے میں آتا ہے کہ مدارس کے فضلاء طلاق کے باب میں غلطی نہیں کرتے ہیں لیکن اسکول و کالج کے تعلیم یافتہ حضرات طلاق کے نظام سے ناواقف ہونے کی وجہ سے عموماً غلطی کرتے ہیں ۔

(۳) جہاں پر مسلمان معاشی اعتبار سے مستحکم ہیں وہاں پر پوری کوشش ہونی چاہیے کہ سرکار کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے انگلش میڈیم اسکول قائم کئے جائیں اور شہر میں موجود معیاری ادارے سے زیادہ بہتر معیاری اسکول قائم کیا جائے تاکہ ہمارے اسکول، ماڈل اسکول بن سکیں ۔اس کے ذریعہ ہم اپنی نسل کے ذہنوں کو بدلنے والے منصوبوں کے خلاف آسانی سے کام کرسکتے ہیں، اپنی تہذیب وثقافت کا تحفظ کرسکتے ہیں اور بچوں کے دل ودماغ کو مغربی افکار کی یلغار سے بچا سکتے ہیں آزادی کے نام پر اباحیت کے جس دلدل میں دھکیلنے کی سازش کی جارہی ہے اس کے ذریعہ ہم اس کا تدارک کرسکتے ہیں۔اسی ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی جائے، اس لیے کہ منصوبہ بند طریقہ پر بچیوں کو ان کے ایمان سے بے دخل کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں، کوشش کی جائے کہ لڑکیوں کے لیے مسلم ادارے ترجیحی طور پر قائم کئے جائیں اور جہاں ایسا ممکن نہیں ہے وہاں بچیوں کے والدین کو بیدار ہوکر اپنے بچیوں کی نگرانی کا فریضہ انجام دینا چاہیے۔

(۴) چار ستمبر کو مولانا امین عثمانیؒ کی ایک آن لائن تعزیتی نشست میں شریک ہوا تھا، مولانا کی زندگی پر بہت سے حضرات اہل علم نے روشنی ڈالی ان کی خوبیوں میں ایک اہم خوبی کا تذکرہ مختلف حضرات نے کیا کہ مولانا امین عثمانی نئی نسل کی تربیت کا کام کیا کرتے تھے، مولانا امین عثمانی چوں کہ مولانا قاضی مجاہدالاسلامؒ کے تربیت یافتہ تھے، اور مولانا مجاہدالاسلام قاسمیؒ کی خاص بات یہ تھی کہ وہ رجال ساز اور افراد ساز تھے، افراد سازی پر ان کی خاص توجہ تھی، میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس اس میدان میں کمی آگئی ہے، تعلیم کے زمانے میں اساتذہ بچوں کی تربیت کرتے ہیں اور اسی تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ہمارے فضلاء زندگی کے ہر میدان میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں اور مادیت کے اس طوفانی اور سیلابی دور میں بھی فضلاء مدارس صلے اور انعام سے بے پرواہ اور معاشی زندگی سے بے نیاز رہ کر دین کی خدمات میں مصرف رہتے ہیں لیکن ایام تعلیم کے بعد جب ہمارے فضلاء کسی میدان میں کام پر لگ جاتے ہیں تو اس زمانے میں بھی ان کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے یہ زمانہ ان کے شعور وادارک اور احساس وذمہ داری کا زمانہ ہوتا ہے، اس زمانہ میں تربیت اور افراد سازی سے پتھر کو پارس اور سیپ کو موتی بنایا جاسکتا ہے، اوپر جن حضرات کا تذکرہ کیا گیا ہے یہ وہ لوگ تھے جو فضلاء مدارس کو ان کی صلاحیت کے لحاظ سے کام پر لگایا کرتے تھے، ان کی تربیت اور حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے، اگر کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو معاشی یا علمی طرح سے مدد کیا کرتے تھے میں یہ سمجھتا ہوں اس میدان میں وسیع پیمانہ پر کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ قوم کو ان کی ضرورت کے مطابق کام کے افراد مہیا کرائے جاسکیں۔اس سلسلے میں بڑے تعلیمی اداروں کو بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے ہمارے جو فضلاء میدان عمل میں مصروف ہیں ان کے احوال کا جائزہ لیا جائے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان کو کام کے مناسب مواقع مہیا کئے جائیں اس وقت جس رفتار کے ساتھ ہمارے مدارس سے افراد فارغ ہورہے ہیں ان کو اس تناسب سے کام کی جگہیں نہیں مل رہی ہیں جس کی وجہ سے بہت سے ہمارے قیمتی جوہر ضائع ہوجاتے ہیں جب کہ یہ وہ افراد ہیں جن پر قوم کے ہزاروں روپے اور بڑے اساتذہ کی دور رس تربیت کا حصہ لگا تھا دس یا بارہ سال ہم نے ان پر محنت کی تھی ان کا ضائع ہوجانا میں سمجھتا ہوں اپنی محنت کا ضائع ہونا ہے ان پر نظر نہ رکھنا اپنے ہی کام سے صرف نظر کرنا ہے۔فکر کے نہاں خانے میں یہ باتیں گردش کررہی تھیں اسے صفحات پر منتقل کرکے آپ کے سامنے پیش کیا ہے اس امید کے ساتھ اگر ان پر توجہ دی گئی تو وہ دن دور نہیں کہ نئی نسل کا مستقبل تابناک ہوگا۔

(قسط:۲)

ڈاکٹر آصف لئیق ندوی اردیاوی

آزاد ہندستان اور بنیادی انسانی حقوق؟!

قارئین کرام نے پہلی قسط میں آزادی کے اقدار اور ہمارے رویے پر سرسری جائزہ پڑھ لیا ہوگا، دوسری قسط میں حقائق وشواہد کی روشنی میں ہمارا طرز عمل پیش ہے، اسمیں کوئی شک نہیں کہ ملک ہندوستان کی مٹی، اسکے کلچر اور گنگا جمنی تہذیب کی بقاوتحفظ اور اس سے محبت کے اظہار کیلئے مسلمانوں نے بہت کچھ لکھا ہے، اردو میں لکھنے والوں نے آزادی کے بہترین نغمے لکھے، عمدہ نظمیں لکھیں، حقیقت پر مبنی ڈرامے پیش کیے اور اپنے اعمال واخلاق سے آنے والی نسلوں کو یہ باور کرانے کی ہر ممکن کوشش کی کہ آج ہم جس آزاد سرزمین میں آباد ہیں، اسکے پیچھے خون کے آنسوؤں میں ڈوبی ہمارے بڑوں کی قربانیوں کی طویل داستانیں ہیں، ہمارے آباء و اجداد نے ملک کی آزادی میں اپنی اپنی ذمہ داریوں کا حق ادا کیا ، اسکے لیے اپنی قیمتی جانوں کا بے شمار نذرانہ پیش کیا اور تاحال ملک ودستور سے وفاداری کی جو مثال ہندوستانی مسلمان پیش کر رہے ہیں، وہ اوروں کے مقابلے میں قابل ستائش اور لائق داد وتحسین ہے، ملک کے عروج وترقی میں مسلمانوں کا رول وکردار بہت نمایاں ہے، وہ کسی معاملے میں قوم وملک اور انسانیت کی خیرخواہی اور اسکی ترقی وعروج میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں حتی کہ وہ اپنی نسلوں کو آزادی کے اقدار، انسانیت کیساتھ ہمدردی اور رواداری کی تعلیم وتربیت اور اسکی اہمیت وافادیت بتا کر انہیں ملک کا سچا پکا ہندوستانی شہری اور اسکا حقیقی وفادار بنا رہے ہیں، مگر ملک میں دوسری جانب سے کیا ہو رہا ہے؟ یہ بات قابل گرفت ومؤاخذہ ہے، اسی بات کی سچائی اور حقائق کی روشنی میں یہ ادنی کوشش ہے جو راقم السطور نے اپنی اس تحریر سے پیش کی ہے۔ اس امید کیساتھ۔۔۔ کہ

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے!
شاید کہ اتر کر جائے ترے دل میں میری بات

قصہ مختصر یہ ہے کہ ابتدا میں انگریزوں نے اسوقت کے مسلم بادشاہ جہانگیر سے تجارت کی اجازت طلب کی، جب انہوں نے یہاں اپنے پیر جما لیے تو رفتہ رفتہ فرنگیوں نے سازشوں کا جال بچھانا شروع کیا اور پورے ملک کو اپنے قبضے میں کر لیا! جن سے طویل جدوجہد اور لڑائیوں کے بعد پھر یہ ملک ظالموں کے پنجے اور انکی غلامی سے آزاد ہوسکا، اگر دوبارہ پھر کوئی اسی طرح دھوکہ دے کر ہم سے ہماری آزادی کا حق سلب کرے یا ہماری معاشرتی اقدار، ہماری قربانیوں اور آزادی کی عظیم نعمت کو چھین کر متنازعہ تہذیب و قانون نافذ کرنا چاہے تو کیا بادشاہ جہانگیر کیطرح ہم بھی دھوکہ کھالیں جبکہ مؤمن کی یہ شان امتیازی ہے کہ "**لایلدغ المؤمن من جحر مرتین**" ترجمہ:"مؤمن ایک ہی سوراخ سے دوبار ڈسا نہیں جاتا ."ہاں اعمال واخلاق میں کمیوں اور کوتاہیوں کیوجہ سے مؤمن مختلف آزمائشوں کا شکار تو بن سکتا ہے، مگر وہ دوبارہ دھوکہ نہیں کھا سکتا! مسلمان قوم اپنے آٹھ سو سالہ طویل دور حکمرانی میں بھی اس ملک کے وفادار تھے اور آج بھی ہیں اور ان شاء اللہ کل بھی رہیں گے۔ ملک کی سالمیت کے لیے مسلمان کبھی بھی خطرہ ثابت نہیں ہوئے اور نہ وہ اور انکی آبادی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ ملک میں جس بات کے لیے اتھل پتھل اور سازشیں ہو رہی ہیں وہ وہم وگمان اور شک وشبہ پر مبنی ہیں، نہ تو مسلم آبادی کی بڑھوتری ملک کے خطرہ ہے اور نہ اسلامی اسٹیٹ کے قیام کی افواہ پھیلا کر برادران وطن کو گمراہ کرنا درست ہے۔

آیئے! آزادی کے تصورات ومعاہدات کو سامنے رکھتے ہوئے تاریخ کی روشنی میں ہم اس بات سرسری جائزہ لیتے ہیں۔ تاکہ حق حق ثابت ہوجائے اور باطل باطل۔۔۔اور باطل سے دب کر خاموش بیٹھ جانا مسلمانوں کا شیوہ نہیں ہوسکتا!! کیونکہ

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

آزادی اور حریت کا مفہوم وتصور:- آزادی اور حریت کا جو مفہوم ہمارے پرکھوں نے پیش کیا ہے؟ اور آزادیٔ رائے اور بنیادی انسانی حقوق کا مفہوم وتصور جیسا انکے ذہن و دماغ میں موجزن تھا؟ جسکی ترجمانی ایک طرف انکی عظیم قربانیوں سے ہوتی ہے، تو دوسری طرف ملک کا ذرہ ذرہ انکے اعلی اقدار وکارناموں کی گواہی دے رہا ہے، اسی طرح جمہوری دستور وآئین اور ہندو مسلم اتحاد واتفاق کی داستانوں سے انکی اعلی ظرفی اور معتدل مزاجی کی صحیح عکاسی ہوتی ہے۔

مگر افسوس! تغیرات زمانہ کیساتھ ساتھ ہم اپنے آزاد ملک میں رہتے ہوئے بھی آزادی کی پوری لذت وفرحت سے محروم ہوتے جارہے ہیں یا ہمیں اس سلسلے میں بڑے مغالطہ میں ڈالا جارہا ہے، ایک عرصے سے ہمیں آزادی کے نام پر بے وقوف بنانے کی کوشش کی جارہی ہے؟ فرنگیوں کی غلامی اور ان کے جور وظلم سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ملک میں کچھ نام نہاد تنظیموں اور شر پسند عناصر نے ملک کے پرامن ماحول کو بگاڑنے کی کوشش شروع کی اور تاحال شدت سے جاری ہے، دوسری طرف بعض مفاد پرستوں، سیاسی شعبدہ بازوں بالخصوص فرقہ پرستوں نے ظاہرا لوگوں کی آنکھوں پر پٹیاں ڈالکر ہزاروں ایسے انسانیت سوز اور نفرت آمیز کارنامے انجام دئے جن سے آزاد بھارت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے، پرکھوں کے خوابوں کی تعبیر غلط ثابت ہونے لگتی ہے، دستور و آئین اور بنیادی انسانی حقوق پر گہری ضرب پڑتی ہے، جو آزادی کے مفہوم ومعنی اور اسکے وسیع وعریض مطالبے اور تقاضے سے متصادم ہیں، جن سے آزادی کے اقدار کی صریح خلاف ورزی بلکہ اسکی توہین ہوتی ہے، یہ وہی لوگ ہیں جو اپنی زبانوں سے آزادی کے نعرے، نغمے اور اسکے ترانے تو ضرور گنگناتے، پڑھتے اور سنتے ہیں! مگر انکا دل اور ضمیر اسکے معنی ومفہوم اور مطالبے کے برعکس کام کرتا ہے اور آزادی کی روح سے انکا کا ذہن ودماغ روگردانی اور سرکشی کررہا ہے اور آزاد ملک اور انسانیت کے اقدار کی دھجیاں اڑا رہا ہے، اسی لیے بالخصوص حکمراں طبقے سے ہمارے چند سوالات ہیں؟ اور انکے دوہرے معیار اور دوغلی پالیسی پر چند سوالیہ ہیں، جنکی نشاندہی کرنا ہر آزاد ہندوستانی اور باوقار شہری کا عین فریضہ اور حق ہے، جبکہ ہم سب ان اقدار کے محافظ بھی ہیں، مگر عام طور پر ملک کے محافظوں اور حکمرانوں کے رویے اور انکی زبان ودل میں آزادی کے معنی ومفہوم کی جو یکسانیت اور مطابقت ہونی چاہیے وہ یکسر معدوم ہوتی دیکھائی دے رہی ہے، جو بڑے خطرے کی بات اور خطرناک رول ہے۔ پھر انسانیت کیونکر آزادی کی لذت ومٹھاس محسوس کر سکتی ہے؟ جمہوری ملک اور اسکی گنگا جمنی تہذیب کی روایتوں کو بالخصوص مسلمانوں کے لیے کڑوے پہ کڑوا بنا کر پیش کیا جارہا ہے! انکا چین وسکون، جینے مرنے کے اصول، انکی بہترین تعلیم وتربیت، عمدہ کھانا پینا، آزادی کیساتھ اپنے مذہب پر عمل پیرا رہنے کو چھینا جارہا ہے، مساجد ومدارس کو آباد وشاداب کرنے اور مراکز ومکاتب کو فعال وکارگر بنانے کی کوششوں کو مشکلات سے دوچار کیا جارہا ہے، کبھی دہشت گردکا اڈہ تو کبھی بیماری کی چھوا چھوت کا نشانہ بنا کر پوری مسلم کمیونٹی کو ٹارگٹ بنایا جارہا ہے یہ سب فرقہ پرستوں کا کارنامہ جو حکومت کی سرپرستی میں وقوع پذیر ہورہا ہے؟ آئے دن مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے کیے جارہے ہیں؟ ہندو مسلم کے تنازعات وواقعات پر کمی کے بجائے زیادتی دیکھنے اور سننے کو مل رہی ہے؟ فرقہ پرستوں کو اتنی کھلی چھوٹ آخر کہاں سے مل رہی ہے؟ انکے قول وعمل پر آخر لگام

کیوں نہیں لگائی جارہی ہے؟ جس میں کوتاہی کے باعث جو متضاد تصویریں ابھر کر سامنے آرہی ہیں اور انکا نفرت آمیز رویہ اور معاملہ آزادی پر قدغن بنتا جارہا ہے، آخر اسکا سد باب کب اور کیسے ہوگا؟ آخر ترنگا جھنڈا کے مفہوم و معنی اور قول و فعل میں اتنے بڑے تضادات ہمارے آنکھوں کے سامنے ہے مگر حکومت اس پر چپی سادھے ہوئے ہے؟ جبکہ ہمارے ملک میں ترنگا جھنڈا کی توہین و بے حرمتی پر جرمانے یا تین سال قید بامشقت یا بیک وقت دونوں سزا پہلے سے مقرر ہے! مگر جنکا دل اور ضمیر پرچم کے حقیقی معنی اور مفہوم پر متفق نہ ہو، تو ان پر مناسب سزا کی تجویز حکومت، مقننہ، عدلیہ اور حفاظتی دستوں کے پاس زیر غور کیوں نہیں ہے؟ کیا اس پر کنٹرول کی ذمہ داری حکومت کی ذمہ داری نہیں ہے؟ جس سے جمہوریت کی بقاو تحفظ اور اسکے خوگروں کو اطمینان حاصل ہو اور فرقہ پرستوں اور دستور کے باغیوں کے دل میں ڈر اور خوف پیدا ہو!! تاکہ دوبارہ کوئی بھی آئین مخالف، دستور مخالف، مسلم مخالف اور انسانی حقوق مخالف پالیسی کی تجویز ذہن میں سوچ نہ سکے اور اسکی جرأت نہ کر سکے!! جو لوگ اپنے کردار اور رویے سے انسانیت کا دل دکھاتے ہیں! آزادی کے اصول وقوانین توڑتے ہیں! وہ صرف اپنے مفادات اور ذاتیات کا خیال ملحوظ رکھتے ہوئے، دوسروں کے حقوق کے لیے ان کے دلوں میں کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ وہ دوسروں کے حقوق غصب کر رہے ہیں! یہ وہی لوگ ہیں جو قانون شکنی کے باوجود بھی اپنے لئے نجات کی راہ تلاش کر لیتے ہیں، اور حکمرانوں سے انہیں مدد بھی فراہم کی جاتی ہے، جبکہ وہیں مسلمانوں کو حق بات بولنے پر دہشت گرد، ملک کا غدار اور پاکستانی ایجنٹ کا ہم نوا بتلا کر گودی میڈیا کے ذریعے خوب ہنگامہ اور شور مچایا جاتا ہے اسی مسموم فضا کی وجہ سے ملک کے مختلف خطوں میں معصوم مسلمانوں اور بے قصوروں پر قاتلانہ حملہ ہو جاتا ہے اور عمومی طور پر مسلمانوں کا گلا دبانے اور انکے حقوق ہضم کرنے اور مال و دولت کو لوٹنے یا تباہ کرنے کی ناپاک کوششیں ہوتی ہیں، جیسا کہ حالیہ دہلی اور اس سے قبل گجرات کا فساد ہمارے نظروں کے سامنے ہے۔ اکثر اوقات انکو قتل کرتے ہوئے ظالموں کو رحم تک نہیں آتا ہے، بڑی بے دردی سے انسانوں کا ناجائز خون بہاتے ہوئے انکا سینہ اور دل نہیں کانپتا ہے! آخر ان مظالم کا ذمہ دار کون ہے اور کن کے اشاروں پہ واقعات انجام دیے جارہے ہیں، کیا یہی ہمارا آزاد ملک ہے؟ اس لیے کہ وہ لوگ مسلمانوں کو اپنا اصلی حریف اور ہندو راشٹریہ کے قیام میں بہت بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں، اسلئے مسلمانوں کی جان، مال اور عزت کی پامالی کر کے ان کے دلوں میں خوف پیدا کر دو کہ وہ دوبارہ کسی ظلم پر سر نہ اٹھا سکیں۔ اس لیے وہ اپنے کی تکمیل یہ ناپاک کارنامہ انجام دیتے ہیں اور ذرا سی عار اور شرم بھی محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اگر حکومت کی نیت میں کھونٹ نہ ہوتی تو یہ ظلم وستم کا یہ باب اور سلسلہ کب کے نابند ہو گیا ہوتا؟ مگر جب چوکیدار کی نیت میں ہی کھونٹ ہو تو شر پسند عناصر کیا کریں؟

اسی طرح وہ کبھی مسلمانوں کو معمولی باتوں اور ادنی شک وشبہ کیوجہ سے سفر وحضر میں بھی قصداً قتل کر ڈالتے ہیں، حکومت خود ان پر کنٹرول کرنے کے بجائے مزید مظلوم مسلمانوں کو ڈرانے، دھمکانے اور انکا دھرم پریورتن کرنے کے لیے الگ سے سی اے بے جیسا دستور مخالف قانون پاس کرواتی ہے! کیا یہی اس ملک کی آزادی اور آزاد بھارت کا یہی تصور ہے؟ اگر مظلوم ظلم وستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور دھرنے پر اتر آتے ہیں تو متعدد مقدمات، جھوٹے دفعات میں پھنسا کر انہیں سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے، جس ملک میں انہیں حق بات بولنے کا بھی اختیار نہیں رہ گیا ہو! حق پر رہتے ہوئے بھی انہیں دردناک سزا دی جاتی ہو، اور طویل سزا بھگتنے کے باوجود بھی انہیں رہائی نصیب نہیں ہوتی ہو! ایسی حکومت اور اسکے زمانے میں ہوئے قتل وغارت کے واقعات کو آخر کس پر تھوپا جائے؟ جو ہر اعتبار سے آزاد ملک کی روح ومزاج کے خلاف ہے، انسانی حقوق کی صریح خلاف ورزی

خطیب رفعت اللہ رفعتؔ ۔نیویارک امریکہ

غزل

ہم اندھیرے میں جلا کرتے ہیں
شمع کا فرض ادا کرتے ہیں
یاد رکھے گا دعاؤں میں ہمیں
آپ کے حق میں دعا کرتے ہیں
شاعری ذوق ہے پیشہ تو نہیں
آپ بتلایئے کیا کرتے ہیں
جانے کیوں ان کی زباں ہے خاموش
آج کل صرف سنا کرتے ہیں
جن کے ہونے کا نہیں ہے احساس
ایسے کچھ لوگ ہوا کرتے ہیں
آج ان کا نہیں گیتی میں مقام
وہ مرے دل میں بسا کرتے ہیں
غیر تک ان کی شکایت نہ گئی
صرف آنکھوں سے گِلہ کرتے ہیں
اپنا دکھ ذکر ہوا جاتا ہے
اللہ اللہ کیا کرتے ہیں
ایسی کیا لاگ لگی ہے ان کو
روز رفعت سے ملا کرتے ہیں ،

فضیل فوزؔ۔ حیدرآباد

بابری مسجد کی کہانی بابری مسجد کی زبانی

کس واسطے آخر یہ مِرا قتل ہوا ہے
کوئی تو بتائے مجھے کیا مِری خطا ہے

تاریخ کے اوراق بتا دینگے تمہیں سب
دشمن نے مِرے نام پہ کیا کچھ نہ کیا ہے

اک جائے عبادت ہوں فقط امن کا گھر ہوں
حیرت ہے مِری ذات سے اوروں کو گِلہ ہے
دنیا کی عدالت کی مجھے کچھ نہیں پرواہ

انصاف کرے گا وہی جو سب کا خدا ہے
کچھ لوگ مِرے نام پہ کرتے ہیں سیاست
اے اہل زمانہ تمہیں کیا اِس کا پتہ ہے

مسجد ہی رہوں گی میں یہاں تا بہ قیامت
ہر وقت یہی دہن پہ مسجد کی صدا ہے

اے فوزؔ تو پہنچادے مِری بات جہاں میں
حق دہر کے آگے نہ جھکا تھا نہ جھکا ہے

ہے، جمہوری دستور سے متصادم رویہ ہے، کیا یہ آزاد بھارت اور اسکے آزاد نظام و دستور اور حکمراں طبقے پر سوالیہ نشان چسپاں نہیں کرتا؟ جو سراسر مظلوموں کیساتھ نا انصافی پر مبنی عمل ہے، آزادی رائے، پرچم کشائی، ترنگا کے مفہوم، اس کے ترانے کے تقاضے اور مطالبے کے بالکل مغائر ہے۔۔۔۔۔۔۔۔جاری

راحلہ پروین۔ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پیغام آفاقی کی افسانوی جہات

1980ء کے بعد جن قلم کاروں نے اردو فکشن میں فکر و فن کے نئے در وا کیے ان میں ایک اہم نام پیغام آفاقی کا بھی ہے۔وہ بیک وقت ایک کامیاب افسانہ نگار، مشہور ناول نویس، شاعر اور اسکرپٹ رائٹر بھی ہیں۔1989ء میں ان کا ناول ''مکان'' منظر عام پر آیا جسے ناقدین و قارئین نے خوب پسند کیا اور سراہا بھی۔اردو کے مشہور و معروف نقاد پروفیسر آل احمد سرور نے اس ناول کو عہد جدید کے زوال پذیر رویوں کے خلاف ایک جہاد عظیم بتایا ہے۔2001ء میں ان کا شعری مجموعہ ''درندہ'' منظر عام پر آیا۔26/افسانوں پر مشتمل افسانوی مجموعہ ''مافیا'' 2002ء میں شائع ہوا۔ان کا ناول ''پلیتہ'' 2011ء میں دہلی سے چھپا۔بعد وفات ان کا ناول ''دوست'' سلمان عبد الصمد اور ان کی زوجہ رضیہ سلطانہ کی مشترکہ کوششوں سے 2018ء میں منظر عام پر آیا جو لیوان ریلیشن کے مسائل و معاملات سے متعلق ہے۔ان کی غیر مطبوعہ تخلیقات میں ایک ناول ''راگنی'' اور ایک ڈرامہ ''یہ شہر کس کا ہے'' شامل ہیں۔

پیغام کی موضوعاتی کائنات بہت وسیع ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں علاقائی، ملکی اور عالمی مسائل و موضوعات اور حادثات و واقعات جیسے تشدد، انتہا پسندی، دہشت گردی، صارفیت، قوموں کا زوال، اقدار کی پامالی، ہوس کی اجارہ داری، گم شدہ تہذیب، معاشرتی جبر، عورتوں کا استحصال، افسروں کی رشوت خوری، سیاست دانوں کی مکاری، بے روزگاری، شہری زندگی کی کشمکش، نیا عریاں کلچر وغیرہ کا حقیقی اور دردانگیز بیان کیا ہے۔انہوں نے اس قسم کے گوناگوں مسائل کو پیش کر کے اپنے عہد کی سچائیوں کو بے نقاب کیا ہے جس سے ان کی دردمندی، عصری شعور اور آفاقی فکر کا پتہ چلتا ہے۔اپنی تخلیقی جہات کا ذکر وہ خود یوں کرتے ہیں:

> ''میں نہ تو پیشہ ور ناول نگار ہوں اور نہ ہی نام و نمود کے لیے لکھتا ہوں۔میں ایک تخلیقی مفکر ہوں۔ناول اور افسانے میں تفریح کا سامان مہیا کرنے کے لیے نہیں لکھتا بلکہ میں قارئین کو زندگی کی پیچیدگیوں سے روشناس کرانے کے لیے لکھتا ہوں۔پیشہ کے اعتبار سے دہلی جیسے شہر میں پولیس کے محکمے میں ہونے کی وجہ سے مجھے زندگی کے سیاہ و سفید کو زیادہ گہرائی سے دیکھنے کو موقع ملا۔۔۔۔۔فکر و ادب میرے لیے اتنا سنجیدہ معاملہ ہے کہ وہ لوگ جو ادب کو تفریح یا نمود کے حوالے سے دیکھتے ہیں وہ میرے سروکار سمجھ نہیں سکتے لیکن مجھے بھی سروکار ان سے نہیں بلکہ مجھے سروکار اس ذہین طبقے سے ہے جو زمانہ سازی کو اپنا مشغلہ بناتا ہے۔'' (میں اور مافیا کی جہات، مشمولہ ''مافیا'' سن اشاعت ۲۰۰۲، ص:۱۴)

پیغام کی تخلیقات ان کے اس بیان پر کھری اترتی ہیں۔وہ معاشرہ میں پھیلی برائیوں کو بے نقاب کرتے ہیں اور ان پر گہرا طنز بھی کرتے ہیں۔وہ ادب برائے زندگی کو اپنا نصب العین سمجھتے ہیں اور ادب کو ایک صالح معاشرے کی تشکیل کا اہم عنصر مانتے ہیں۔

پیغام آفاقی کا ناول مکان 1989ء میں شائع ہوا جو ان

کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔اپنی بنت اور پیش کش دونوں کے لحاظ سے یہ اردو ادب کا ایک منفرد ناول ہے۔اس کا مرکزی کردار ''نیرا'' ہے جو میڈیکل سائنس کی طالبہ ہے۔نیرا کے کردار کو پیغام نے اپنے فکر وفن کی بدولت ایک آفاقی تانیثی کردار بنادیا ہے۔

طالبہ 'نیرا' کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ چکا ہے۔وہ اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ اپنے مکان میں رہتی ہے۔نیرا کے مکان میں کمار نامی ایک کرایہ دار بھی رہتا ہے۔کمار نیرا کے ذاتی مکان کو ہڑپنا چاہتا ہے۔اس کام کو پورا کرنے میں کرایہ دار کا ساتھ کچھ پولیس والے اور اشوک نامی شخص بھی دیتا ہے۔کمار حتی الامکان نیرا اور اس کی بوڑھی ماں کو گھر چھوڑ کر جانے پر مجبور کرتا ہے لیکن نیرا ایک تعلیم یافتہ اور دلیر لڑکی ہے وہ اتنی آسانی سے ہمت نہیں ہارتی بلکہ ان تمام پریشانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔بالآخر نیرا کو جیت حاصل ہوتی ہے اور کمار کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پیغام آفاقی کا ناول 'مکان' ہیت، موضوع اور فن کے لحاظ سے ایک نیا اور منفرد ناول ہے۔یہ ناول پیغام آفاقی کی گہری بصیرت، فنی مہارتوں، اور وسیع فکر کا نتیجہ ہے۔اس ناول میں پیغام آفاقی نے بیسوی صدی کی زندگی کے تلخ پہلوؤں کو کہانی کے روپ میں پیش کیا ہے۔یہ ناول جدید دور کے زوال پذیر رویوں، جمہوریت کے سائے میں گزرنے والی زندگی اور اس کا المیہ، افراد کی مادی وروحانی کشمکش، بڑھتی ہوئی رشوت خوری، نوکر شاہوں کی بدعنوانی، پولیس افسران کے مظالم، عورت کا استحصال اور اس کو کمتر سمجھنے کی سوچ، اقدار کی پامالی اور ہندوستانی سماج کی روز مرّہ کی زندگی کا گہرا تجزیہ پیش کرتا ہے۔یہ مسائل اگرچہ نئے نہیں ہیں لیکن پیغام آفاقی نے ان موضوعات کو اپنے ناول مکان میں ایک نئے اور منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔اس ناول میں بیان کردہ زندگی کے حقائق قاری کو غور وفکر پر مجبور کرتے ہیں۔

'نیرا' کا کردار اس دور کے ان تمام سادہ لوح انسانوں کی کہانی پیش کرتا ہے جو ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانے کا حوصلہ اور جذبہ رکھتے ہیں۔نیرا ایک سچے، بہادر، نڈر، حوصلہ مند اور حقوق کی حصولیابی کے لئے سینہ سپر ہونے والے شخص کی علامت ہے۔مکان کی گوناگوں خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر ملا بخش لکھتے ہیں:

> ''مکان'' غیر روایتی انداز کا ناول ہے اور اپنے عہد میں موضوع اور فن کے اعتبار سے اچھوتا فن پارہ ہے جس میں مابعد الطبیعاتی، اساطیری، ایمائیہ انداز اختیار کرتے ہوئے عورت کے کردار کو آج کے تناظر میں رکھ کر پورے عہد کی نفسیات کو ٹٹولنے کی کوشش کی گئی ہے۔'' (مکان، ص:62)

ناول ''پلیتہ'' ڈیڑھ سو سال کی تاریخ پر مشتمل ہے۔اس کا موضوع کالا پانی ہے۔یہ ناول 2011ء میں منظر عام پر آیا۔ناول کی شروعات خالد سہیل کی موت سے ہوتی ہے۔اس کی موت کے اسباب وعلل کی چھان بین ہی پورے ناول کی کہانی ہے۔ناول کے مرکزی کردار کے پردادا کا نام میر علی تھا جن کو کالا پانی کی سزا سنائی گئی تھی اسی کی تفتیش کے لیے وہ انڈومان نکوبار جاتا ہے اور اپنے دادا کے جرائم کا پتہ لگاتا ہے۔وہاں اس کو ایک ایسا سراغ ہاتھ آتا ہے جو پوری انسانی تاریخ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔یہ پتہ لگانے کے بعد خالد سہیل انسانوں پر ہو رہے ظلم واستبداد اور بربریت کو ختم کرنے کا سوچتا ہے اور ان کو آزادانہ زندگی گزارنے کا حق دینا چاہتا ہے لیکن اس کو احساس ہوتا ہے کہ اس انقلاب کو برپا کرنے میں صرف وہ اکیلا کافی نہیں ہے بلکہ اس بدعنوانی کو جڑ سے ختم کرنے کے لئے پورے سماج کا ساتھ ضروری ہے۔اس کی یہی سوچ اس کی موت کا سبب بنتی ہے۔

'پلیتہ' ہر لحاظ سے 'مکان' سے بہتر اور شاندار ناول ہے۔'مکان' عہد حاضر کا ناول ہے اور 'پلیتہ' کو ہم تین حصوں میں

بانٹ سکتے ہیں ۔ پہلا ماضی جس کا نمائندہ شیر علی ہے ۔دوسرا حال جس کی نمائندگی خالد سہیل کرتا ہے اور تیسرا مستقبل ہے جس کا ہیرو جیلانی ہے ۔مکان میں پیغام آفاقی نے زیادہ تر وقت کرداروں کے ذہن کے نہاں خانوں میں گھس کر ان کے ذہن وفکر کے تجزیہ پر صرف کیا ہے لیکن 'پلیتہ' میں انہوں نے باہر کی دنیا میں کارفرما سیاسی عناصر کی پالیسیوں اور معاشی طرز فکر کو موضوع بنایا ہے۔مکان اور پلیتہ کا موازنہ کریں تو دونوں میں ایک طرح کا ربط و تسلسل نظر آتا ہے۔جس طرح انسان اپنے عیش وآرام کی خاطر مکان بناتا ہے مگر جب تخریبی عناصر اور فاسد قوتیں اس کو مکان سے نکال کر یا بے دخل کر کے کالا پانی بھیج دیتی ہیں تو وہ وہاں جا کر بارود اور تباہ کن اشیا کا ذخیرہ اکٹھا کرتا ہے اور ان کو ساتھ لیکر پھر سماج میں واپس آتا ہے تا کہ اس عہد کی موجودہ باطل طاقتوں اور ظلم واستبداد کو بڑھاوا دینے والی حکومتوں کا تختہ پلٹ کر سماج میں عدل وانصاف، رواداری اور مساوات قائم کر سکے ۔ پیغام آفاقی نے ظالم طاقتوں کے پنجۂ استبداد سے نکلنے کے حل بھی اس ناول میں بتائے ہیں۔شعیب رضا فاطمی لکھتے ہیں:

''اس ناول میں صدیوں سے حاکمانہ جبر واستبداد کا شکار انسان ناول کی گلیوں اور سڑکوں پر چلتے چلتے اپنی اور اپنی اگلی نسلوں کی حقیقی آزادی کی شاہراہ پر آجاتا ہے۔'' (پلیتہ، پشت ورق)

پیغام آفاقی کا تیسرا اور آخری ناول ''دوست'' ہے جو ان کے انتقال کے دوسال بعد 2019ء میں مصنف کی زوجہ رضیہ سلطانہ اور جے این یو کے ریسرچ اسکولر سلمان عبد الصمد کی مشترکہ کوششوں سے منظر عام پر آیا ہے۔دوست اپنے موضوع اور فکر وفن کے لحاظ سے منفرد اور کامیاب ناول ہے۔موضوعی اعتبار سے ناول سب کو چونکاتا ہے۔ in live relationship ایک ایسا موضوع ہے جس پر لکھنا معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن پیغام آفاقی نے سماج میں گھٹیا سمجھے جانے والے اس موضوع کو پوری جزئیات کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کی فکر کی گہرائی اور ذہن کی وسعت سامنے آجاتی ہے ۔میاں بیوی کا رشتہ انتہائی پاک اور اہم ہوتا ہے لیکن آج کے دور میں عورت کو صرف جنسی خواہش کی تکمیل کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے مگر پیغام نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے واضح کر دیا ہے کہ زوجین کے مابین جنس سے اوپر اٹھ کر ایک اور شئی ہے جو انہیں نہ صرف قریب رکھتی ہے بلکہ دونوں میں بہتر تعلقات ،ایک دوسرے کی پرواہ اور ایک دوسرے کے لئے ایثار وقربانی کا جزبہ پیدا کرتی ہے، وہ شئی ہے روح میں اترنا اور جذبات کا احترام کرنا۔

ناول کا مرکزی کردار ''نینا'' اور ''ہاشم'' ایک مثالی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ جہاں پیغام نے نینا کے ذریعہ مرد اساس معاشرے پر کڑا طنز کیا ہے۔وہیں ہاشم کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مرد عورت کے جذبات، خواہشات اور ارمانوں کا احترام کرے ۔آفاقی کے نزدیک عورت کی آزادی اس کا فطری حق ہے ۔اس کے حقوق کی پامالی انتہائی سنگین جرم ہے ۔گویا اس ناول کے ذریعہ پیغام نے ایک بہتر گھر، عمدہ خاندان اور ایک صالح معاشرے کی تعمیر وتشکیل اور بقا کے لئے مرد عورت کی شرکت کو لازمی قرار دیا ہے۔بہر حال یہ ناول اپنے موضوع ،فکر وفن ،لفظوں کے انتخاب ۔زبان وبیان کی سلاست وروانی ،منطقی اور فلسفیانہ دلائل کی وجہ سے ایک کامیاب، منفرد اور اہم ناول قرار دیا جاسکتا ہے۔

پیغام کی کہانیاں دلچسپی اور انوکھی تاثیر کے سبب اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں۔ان کی کہانی میں قاری پوری طرح گم ہوجاتا ہے اور وہ یوں محسوس کرتا ہے جیسے اس واردات یا واقعہ کا عینی

شاہد ہے یا یہ واقعہ اسی کی روداد ہے۔ گویا پیغام آفاقی نے زندگی کی تلخ سچائیوں کو فکشن کے روپ میں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ پیغام آفاقی کو علمی، روحانی اور تہذیبی روایات سے بھرپور آگاہی حاصل تھی۔ ایک پولیس افسر ہونے کے ناطے انہوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں، وہاں کی تہذیبوں اور روایات کو قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا۔ ان کا تجربہ گہرا، مطالعہ وسیع اور مشاہدہ عمیق تھا یہی سبب ہے کہ ان کے افسانوں میں گہرائی و گیرائی، زبان کی سادگی، حقیقت پسندی، انسانی دردمندی، ظلم و جبر سے نفرت اور مخصوص وژن سبھی کچھ موجود ہے۔

پیغام آفاقی جدید بدلتی ہوئی اخلاقی قدروں اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل سے بھی بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے تہذیب و تاریخ کی مدد سے اپنے افسانوں کو خوبصورت تشکیل دینے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح سے انہوں نے جس ہنرمندی سے اپنے افسانے میں تضادات و تصادم، جمالیات کے جزئیات کو نشان زد کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ پیغام آفاقی نے اجتماعی اور انفرادی زندگی کے متعلق انسان کی محرومیوں، افلاس، استحصال، روزمرّہ کی زندگی کے دکھ سکھ اور انسانی رویّوں پر توجہ دی ہے۔ تہذیبی بکھراؤ اور رشتوں کا ٹوٹنا، قدروں کا زوال، معاشرے کا زوال وغیرہ ان کے افسانوں کے اہم موضوعات ہیں۔ ڈاکٹر احمد صغیر لکھتے ہیں:

> ''ان کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے اور فنی تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں وہ اپنے افسانے کے ذریعہ نہ صرف آج کے انسان کے احوال پیش کرتے ہیں بلکہ عصر حاضر کی کربناکی گھٹن اور استحصال کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دیتے ہے انسانی قدروں کا جس طرح زوال ہو رہا ہے اور سماجی رشتے میں جو گراوٹ آئی ہے اس پر بھی ان کی نظر ہے۔''(اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ 1980 کے بعد، ص:138)

پیغام آفاقی نے اردو فکشن کے قالب میں مختلف قسم کے موضوعات کو اپنے گہرے مشاہدے سے آمیز کر کے ڈھالا ہے۔ ان کی کی کہانیاں استعاراتی، تمثیلی اور علامتی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ ان کی کچھ کہانیاں ایسی ہیں جن کو پڑھ کر ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں پیغام آفاقی کی آپ بیتی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کا ''مافیا'' کے نام سے ایک افسانوی مجموعہ منظر عام پر آیا۔ اس میں ان کے کل 26 افسانے شامل ہیں جن کو پانچ حصوں میں بانٹا گیا ہے۔

مافیا میں شامل افسانوں میں ''کیڑے کا دوسرا جنم''، ''کیا کہ رہے تھے''، ''لوہے کا جانور''، ''پیتل کی بالٹی''، ''مسافر'' اور ''کوآپریٹو سوسائٹی'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

''کیڑے کا دوسرا جنم'' ایک علامتی کہانی ہے۔ اس میں ایک مصنف ہے جو اپنی سوچ اور فکر کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے پیش کرتا ہے تو سماج کسی بھی حال میں اس نئی سوچ کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے۔ یہ افسانہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ سماج سے کٹ کر اور معاشرے سے بغاوت کرنا انسان کو گمنامی میں لے جاتا ہے۔ حالات سے سمجھوتہ کرنا ہی عقلمندی کی علامت ہے۔ پیغام نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے اس افسانے میں۔

افسانہ ''کیا کہ رہے تھے'' افسانہ نگار کے مطابق تاریخ کے بازار میں انسانوں کے خرید و فروخت کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں مذہبی و سیاسی دہشت گردی، بدعنوانی، ظلم و جبر اور طاقت و قوت کے سہارے کمزوروں کے استحصال کو بیان کیا گیا ہے۔ پیغام نے ظلم و جبر اور طاقت و حکومت کے ناجائز استعمال کے جو اثرات انسانیت پر مرتب ہوتے ہیں نہ صرف ان کو بیان کیا ہے بلکہ انسانی دکھ درد

کے ساتھ ساتھ اس کا مداوا بھی بتا دیا ہے ۔ان کے افسانے دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح ہمیں کسی موڑ پر لاکر مایوسی اور محرومی میں مبتلا نہیں کرتے بلکہ ہمارے اندر حوصلہ، احتجاج اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا بھی سکھاتے ہیں۔ یہی پیغام کی انفرادیت ہے۔

''لوہے کا جانور'' ایک ایسی کہانی ہے جس میں جدید ٹکنالوجی اور گلوبلائزیشن کے ذریعے ہونے والے نقصانات اور جدید مشینی آلات کے منفی اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ جدید طرز کی مشینوں کی ایجاد کس طرح غریب اور مزدور طبقے کو بے سروپا بنا دیتی ہے۔ کہانی کار نے کہانی میں ٹریکٹر اور دیگر نقل و حمل کی مشینوں کے ذریعے ہونے والے نقصانات اور قدیم آلات جیسے ہل، رہٹ، بیل گاڑی، گھوڑا تانگہ وغیرہ کے خارج از استعمال اور بیکار ہو جانے کو ایک خطرہ بتایا ہے۔ یہ کہانی پیغام کی گہری سوچ اور دور اندیشی پر دلالت کرتی ہے۔

''پیتل کی بالٹی'' ایک رومانی کہانی ہے جس میں شہری اور دیہی زندگی کے مابین کشمکش اور کشاکش کو موضوع بنایا گیا ہے ۔مرکزی کردار وندنا شہر میں آکر نوکر چاکر تمام آسائشوں کے باوجود بھی اپنی زندگی میں وہ سکون اور اطمنان محسوس نہیں کرتی جو پہلے اسے دیہات کی زندگی میں میسر تھا۔اس کہانی میں شہری زندگی کی تیز رفتاری اور بے چینی کو بیان کر کے کہانی کار نے شہری زندگی پر طنز کیا ہے مگر حقیقت نگاری نے اس کی تاثیر میں اضافہ کر دیا ہے۔

افسانہ ''مسافر'' میں دہشت گردی کو موضوع بنایا گیا ہے ۔فرقہ وارانہ فسادات اور دہشت گردی کے واقعات کے ذریعے کہانی کار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دہشت گرد کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور نہ اسے انسانیت کا کچھ دکھ درد اور احساس ہوتا ہے ۔آج کے ہندوستانی ماحول کے تناظر میں افسانے کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی معنویت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

رشوت خوری پر لکھا گیا افسانہ ''کوپریٹو سوسائٹی'' اپنی مثال آپ ہے ۔آج کے دور میں عہدیداران اور افسران وفاداری اور ایمانداری کی حلف اٹھانے کے باوجود کس طرح رشوت خوری کو بڑھاوا دے رہے ہیں اس تلخ حقیقت کا پردہ فاش کرتا ہے افسانہ کوپریٹو سوسائٹی ۔اس میں ایک ایسے سماج کا بیان ہے جو بظاہر بڑا خوشنما نظر آتا ہے مگر اس کے دورں میں جھانک کر دیکھو تو حقیقت عیاں ہو جاتی ہے۔سماج کا کھوکلا پن ،بدعنوانی اور رشوت خوری سب سامنے آجاتی ہے۔احمد صغیر نے اس پر اپنی رائے کچھ یوں دی ہے:

> ''پیغام آفاقی کا افسانہ'' کوآپریٹو سوسائٹی'' جدید معاشرے کی شاطرانہ چالوں سے ہمیں آگاہ کراتا ہے۔یہ معاشرہ بظاہر ہمیں ایک آئیڈیل معاشرہ لگتا ہے اور جس کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہم نہیں تھکتے لیکن دراصل یہ معاشرہ اندر سے اس قدر آلودہ ہو چکا ہے اگر اس کا حقیقی روپ ہم دیکھ لیں تو وحشت ہونے لگے ۔''(اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ 1980 کے بعد،ص:136)

مختصر یہ کہ پیغام کے فکشن میں عالمگیریت اور آفاقیت پائی جاتی ہے ۔ دانشوری کا ثبوت ملتا ہے اور فلسفیانہ فکر بھی ۔انہوں نے اردو فکشن کو جدید اور متنوع جہات سے روشناس کیا ہے ۔ان کا فکشن اردو ادب میں ایک نئی آواز ، ایک نئی فکر اور ایک نئی جہت کا پتہ دیتا ہے۔ان کے ناول اور افسانے معاشرتی مسائل وحادثات کے سچے ترجمان ہیں۔فکر کی گہرائی، دقت نظر ، وسعت مطالعہ، موضوعات کا تنوع ، انداز بیان کی ندرت ، واقعات کا تسلسل ، زبان کی سادگی اور مخصوص فلسفۂ حیات کی وجہ پیغام اردو فکشن میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔

سیدہ زہرا جبین۔حیدرآباد

تقدیر میں ہوتو...

"میں اپنا آسمانی رنگ کا سوٹ پہنونگی جو ممی نے میرے پاس ہونے کی خوشی میں گفٹ کیا تھا". سنایا نے کہا اور عروج نے حامی بھری.

پارٹی والے دن دونوں خوب اہتمام سے تیار ہوئیں تھیں . پارٹی کالیج آڈیٹوریم میں تھی سودونوں سیدھے وہیں پہنچیں . وہ لوگ نبیلہ سے ملکر ایک طرف بیٹھ گئیں، مس فریشر کا کانٹیسٹ چل رہا تھا . آڈینس میں بیٹھے سب ہی لوگ تھالیاں بجا کر پارٹیسپنٹس کی حوصلہ افزائی کررہے تھے . عروج کو کچھ فاصلے پر کاشف نظر آ گیا.

"چل کاشف بھائی سے ملکر آتے ہیں". اس نے اسٹیج پر نظریں گاڑی سنایا کو ٹہوکا دیا.

"تم مل آؤ میں ادھر ہی ہوں". اس نے کولڈ ڈرنک کا سپ لیکر کہا.

عروج اسے گھور کر جانے لگی تو اس نے آواز لگائی.

"جلدی آنا میں اکیلی ہوں". عروج جواب دیئے بنا چلی گئی.

وہ پھر اسٹیج کی طرف متوجہ ہوگئی . کچھ ہی دیر بعد اسے اپنے قریب کچھ آواز آئی اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کے بائیں جانب کرسی پر بیٹھا ایک لڑکا اسی کو دیکھ رہا تھا.

"میرا نام ریان ہے .بی.بی.اے فائنل ایئر. اور آپ؟" وہ اپنے لبوں پر مسکراہٹ سجائی اسی سے مخاطب تھا. وہ متلاشی نظروں سے عروج کو دیکھنے لگی.

"فریشر لگتی ہیں". اس کے چہرے کا رنگ اڑتا دیکھ وہ خود ہی کچھ نتیجے پر پہنچا.

"میں ... نہیں ...وہ"... اس نے اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری . اتنے میں اس کے پیچھے سے عروج چلی آئی.

"السلام علیکم ریان بھائی" آتے ہی اس نے اس لڑکے کو سلام کیا . اور ایک کرسی کھینچ کر ان دونوں کے سامنے بیٹھ گئی.

''اوہ! تو بی-یس-سی بھی آیا ہے''. اس کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی.

''جی'' وہ مسکراتے ہوئے سنایا سے مخاطب ہوئی". یہ ریان بھائی ہیں کاشف بھائی کے دوست" ."اور یہ میری بیسٹ فرینڈ، سنایا". اس نے ایک دوسرے کا تعارف کرایا.

"السلام علیکم" سنایا نے سلام کیا.

"وعلیکم السلام . تم لوگ مزے کرو میں ملتا ہوں". وہ چلا گیا.

" کہاں مرگئی تھی . یہ میری ریگنگ کرنے والا تھا". اس نے کہا.

" .ایسے ہی"... عروج ہنس دی.

اگلے روز دونوں نے اپنی سہیلیوں کو خوب جلایا. کہ یہ دونوں بی.بی.اے کی پارٹی میں جا کر آئی تھیں . اور یہ دونوں سب کی حالتوں سے لطف اندوز ہورہی تھیں.

وہ اب بی.بی.اے بلاک بہت ہی کم جاتی . جب بھی وقت

ہوتا کتابوں میں گھسی رہتی تھیں دوسری لڑکیاں بھی کافی ذہین تھیں . اورانہیں اپنی پوزیشن بنائے رکھنی تھی . کچھ دنوں سے ریان بی-یس-سی بلاک میں نظر آجاتا اور عروج اسے بات کرنا اپنا فرض سمجھتی.

" کتنی بار کہا ہے اسے بات مت کر . اچھا نہیں لگتا وہ ہمارے بلاک کے نہیں ہیں" سنایا اسے سمجھاتی . عروج ایک کان سے سنتی دوسرے کان سے نکال دیتی.

دھیرے دھیرے سنایا کی بھی ریان سے دوستی ہوگئی. اب ہر آئے دن ہی سامنا ہو جائے تو دوستی تو ہونی ہی ہے . سنایا کو محسوس ہو رہا تھا کی ریان عروج میں دلچسپی لے رہا ہے . وہ دونوں ساتھ ہی ہوتی تھیں پر وہ زیادہ بات عروج سے ہی کرتا تھا.

آج سنایا کا برتھ ڈے تھا وہ بہت ہی اہتمام سے تیار ہوکر کالیج آئی تھی . پر کسی نے اسے بات نہیں کی . جب وہ عروج کے پاس جا کر بیٹھی تو وہ اٹھ کر مریم کے پاس چلی گئی. سنایا نے جب سب کو چاکلیٹس دیئے تو سب ہی نے خاموشی سے لئے کسی نے خوشی سے اسے وش نہیں کیا . وہ بہت اداس ہوگئی. جیسے ہی لنچ کے لئے بیل ہوئی تو سب ہی اسے اکیلا چھوڑ کر کلاس سے بہار چلی گئیں .

وہ رو دینے کو تھی . دس منٹ بعد عروج بھاگتی ہوئی آئی اور اسے کھینچتی کنٹین کے قریب لے آئی جہاں فائزہ ہاتھ میں کیک لئے مسکرائے جا رہی تھی اور مریم، فاطمہ اپنا حلق پھاڑے اسے وش کر رہی تھیں . وہ ایک دم حیران سی کبھی ساتھ کھڑی عروج کو دیکھتی اور کبھی اپنی دوسری سہیلیوں کو.

سب نے اسے گفٹس دیئے . کالیج کے بعد وہ لوگ کاریڈور میں آئی ہی تھیں کی ریان انکی طرف بڑھتا دکھائی دیا.

"ہیپی برتھ ڈے" اس نے ایک چاکلیٹ کا باکس اس کی طرف بڑھادیا.

" آپ کو کس نے بتایا؟" وہ بات اس سے کر رہی تھی، پر نظریں عروج پر تھی.

"اہم ... مابدولت نے کل ہی اس چھوٹی سی پارٹی کے لئے نبیلہ آپی، کاشف بھائی اور ریان بھائی کو انوائٹ کیا تھا وہ دونوں نے تو کل ہی معذرت کر لی تھی . اب یہ کیوں نہیں آئے مجھے نہیں پتا". اس نے سوالیہ نظروں سے ریان کو دیکھا.

"تم بچوں کی پارٹیز تھوڑی مختلف ہوتی ہیں . ہم بڑوں کا وہاں کیا کام". انداز انھیں چھیڑنے والا تھا.

"ہم بچے نہیں ہیں . کالیج میں پڑھتے ہیں ہم بھی". عروج نے مغرور ہوکر کہا اور سنایا نے بھی تائید کی . وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا وہاں سے چلا گیا.

دن یوں ہی گزر رہے تھے . عروج اپنی فیملی سمیت شہر سے باہر تھی . سنایا اکیلی ہی کالیج جاتی . ایک دن وہ وین سے اتری ہی تھی کی اسے ریان نظر آگیا . اسے دیکھتے ہی سنایا نے سلام کیا.

"یہ عروج نظر نہیں آتی آج کل؟" ریان نے پہلا سوال یہ ہی کیا تھا.

" آہ! تو جناب عروج کو مس کر رہے ہیں". وہ سوچ کر مسکرانے لگی.

"وہ عروج کی کسی رشتے دار کا انتقال ہوگیا ہے . وہ لوگ کسی دوسرے شہر میں ہوتے ہیں . کچھ دن عروج کی فیملی ادھر ہی رہے گی". اس نے تفصیل سے بتایا.

وہ لوگ چلتے ہوئے بات کر رہے تھے.

"اصل میں عروج سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا . دو دن سے دیکھ رہا ہوں وہ تو نظر نہیں آتی . میں نے سوچا آپ

سے ہی کہہ دوں"۔ کہہ کر وہ رکا۔

"تو میرا شک درست نکلا ۔ موصوف عروج میں انٹرسٹڈ ہیں"۔ وہ پھر سوچنے لگی۔

"کیا ہوا سنایا، کدھر کھو گئی؟" اس نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ پھیرا۔

"آں ہاں! آپ بولیں آپ کو کیا بولنا ہے"۔ اس نے اپنا سر جھٹکا۔

"میرے بارے میں کچھ غلط مت سوچنا"۔ کہتے ہوئے اس نے اپنی ہتھیلی سنایا کی آنکھوں کے سامنے کر دی ۔ وہ لوگ اب سنایا کے بلاک میں داخل ہو چکے تھے ۔ وہ جو مسکرا رہی تھی ایک دم حیران ہو گئی ۔ حیرت سے اس کی بڑی آنکھیں اور پھیل گئیں ۔ اس نے ایک جھٹکے سے ریان کی طرف دیکھا جس کے لبوں پر وہی مچلتی مسکراہٹ تھی۔

"آئی لو یو"۔ یہ کیا لکھا تھا ریان نے ۔ میں تو کچھ اور ہی سمجھ رہی تھی ۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ۔ ریان نے اپنا ہاتھ ہٹایا تو اسے اپنے عین سامنے کچھ فاصلے پر کھڑے فزکس کے لیکچرر نظر آ گئے جو اسی کی جانب دیکھ رہے تھے ۔ مارے شرم کے وہ جیسے زمین میں گڑھتی جا رہی تھی ۔ وہ تیزی سے اپنے قدم اٹھاتی اپنی کلاس کی طرف بڑھ گئی ۔ سارا دن وہ الجھی رہی، ایک طرف اسے ریان کے لکھے الفاظ یاد آتے تو دوسری طرف لیکچرر کی جانچتی نظریں اسے اور پریشان کر رہی تھیں ۔ وہ دن بھر دعا کرتی رہی کی ریان سے سامنا نا ہو ۔ اور ایسا ہی ہوا تھا تین دن ہوئے تھے اس بات کو اور ریان اسے پھر نظر نہیں آیا۔

عروج واپس آ گئی تھی اور آتے ہی اس نے اسے فون کیا۔

"تم ذرا نوٹس لیکر میرے گھر آ جاؤ ۔ کل اتوار کی چھٹی ہے میں کچھ تو کمپلیٹ کر لوں"۔ سنایا اس کے گھر چلی گئی۔

"تم سے ایک بات کرنی تھی"... اس نے نوٹس اتارتی عروج کو مخاطب کیا۔

"ہوں" اس نے بنا دیکھے ہی کہا۔

"جب تم ادھر نہیں تھیں نا ... تو ... ریان بھائی ملے تھے"۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کی اسے کیسے بتاؤں

"تو اس میں اتنی حیران ہونے والی کون سی بات ہے؟" وہ لاپروائی سے بولی۔

"مجھے ... پرو پوز کیا"۔ سنایا نے دھماکہ کیا ۔ اس کے تیزی سے لکھتے ہاتھ ایک دم رک گئے

"فزکس کے سر کڑی نظروں سے دیکھ رہے تھے ۔ شاید انھیں بھی کچھ لگ رہا تھا ہمارے بیچ ۔" وہ بہت شرمندہ تھی کہ استاد کے سامنے اس کی پوزیشن گر گئی تھی۔

"اف! سر نے تجھے دیکھا، اور تو نے کیا کہا ریان بھائی سے؟" وہ بے یقینی کے عالم میں تھی۔

"اس دن کے بعد وہ نہیں ملے مجھے۔

عروج کو کسی لیکچرر نے بلایا تھا ۔ وہ اسٹاف روم میں چلی گئی ۔ سنایا سیڑھیوں پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی، کہیں سے ریان آ گیا ۔ اس نے اپنا رخ پھیر لیا۔

"بات نہیں کرو گی؟" اس نے اتنا ہی کہا تھا کی سنایا برس پڑی۔

"میں آپ کو ایک شریف انسان سمجھتی تھی پر آپ نے ایک چیپ حرکت کرتے ہوئے مجھے غلط ثابت کر دیا ۔ میں اپنے استاد کی نظروں میں گر گئی ہوں، صرف آپ کی وجہ سے ۔ دوبارہ مجھ سے بات مت کریں"۔ سخت لہجے میں کہتی ہوئی وہ رکی نہیں، تیز قدموں کے ساتھ وہاں سے نکل گئی۔

آج جب اسے دانش نے رد کر دیا تو وہ سمجھ رہی تھی کہ خدا نے اسے ریان کو رد کرنے کی سزا دی ہے" ۔ شاید وہ سہی

تھا اور میں غلط" وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ جاتی.

"تو نے ریان کو کوئی خواب نہیں دکھائے تھے" عروج اسے سمجھاتی.

"ہاں! یہ ہی میری سزا ہے . شاید میں ہی قصوروار تھی . میں نے ریان کو رد کیا اور دانش نے مجھے، حساب برابر ..." وہ ہم کلامی کرتی.

"جو تمہارا رشتہ آیا ہے اس کا کیا کرو گی؟" عروج جیسے اسے کھوج رہی تھی.

"میں کسی سے شادی نہیں کر سکتی". توقع کے عین مطابق جواب موصول ہوا.

" کیوں ناشکری بن رہی ہو؟ ٹھیک وقت پر ایک اچھا رشتہ آیا ہے انکار مت کرنا". وہ اسے سمجھا رہی تھی.

"تم نہیں سمجھو گی عروج . وہ میرے دل سے جاتا ہی نہیں . اسے دل میں رکھتے ہوئے میں کسی اور سے شادی کیسے کر لوں؟ کیا یہ سہی ہو گا؟" آج پندرہ دن ہو گئے تھے دانش سے بات کیا۔

آج گھر میں عجیب ہلچل تھی یہ اپنی ہی دھن میں کچن میں کچھ بنانے کی غرض سے آئی تھی . جب سے دانش نے دھوکا دیا تھا وہ خود کو گھر کے اور کچن کے کاموں میں مصروف کر چکی تھی. لیپ ٹاپ اس نے ہمیشہ کے لئے ثانیہ کو دیدیا تھا . ٹی. وی. اب اس کا نیا مشغلہ بن چکا تھا . وہ فریج سے کچھ نکال رہی تھی ممی چلی آئیں.

"شام کو گھر پر کچھ مہمان آنے والے ہیں". ممی نے اطلاع دی.

"اچانک ہی؟ ویسے کون آ رہا ہے؟" وہ حیران ہی تو تھی.

"تمہارے چچا کی فیملی اور پاپا کے کچھ دوست آئیں گے . تم چاہو تو عروج کو بھی بلا لو". ممی نے کہا.

"لیکن کس خوشی میں؟" وہ الجھ گئی.

"تمہارے پاس ہونے کی خوشی میں ایک چھوٹی سی دعوت رکھی ہے . اب تم اتنے سوال مت کرو کہ سارا دن جواب دینے میں ہی نکل جائے۔ ممی کچن سے چلی گئیں.

"ہونہہ! رزلٹ آ کر زمانے گزر گئے اور پارٹی اب کی جا رہی ہے". وہ کچھ سمجھتے ہوئے سوچنے لگی.

مہمان آنے میں کچھ ہی دیر تھی اور سنایا ابھی تک تیار نہیں ہوئی تھی . بے دھیانی میں اس نے ایک عام سا سوٹ نکالا تھا، اتنے میں ثانیہ اندر آ گی.

"باجی آپ ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہیں؟" کہتے ہوئے وہ اپنے وارڈروب کی طرف بڑھی اور ایک پیکٹ نکال کر اسے تھما دیا.

" کل ممی یہ ڈریس لیکر آئیں تھیں آپ کے لئے . آپ سو رہی تھیں تو میں نے رکھ دیا". وہ باہر نکل گئی.

وہ بے دلی سے تیار ہونے لگی . پرپل کلر کا سوٹ جس پر نازک سا کام تھا اسے پسند تو بہت آیا تھا پر کسی چیز کے چھن جانے کے احساس نے اس کی ہر خواہش کو مار دیا تھا. نازک سا سونے کا لاکٹ سیٹ پہنے ہلکے سے میک اپ کے ساتھ اپنے شولڈر کٹ بالوں کو کھلا چھوڑے وہ بہت دلکش لگ رہی تھی . ثانیہ ہر دو منٹ میں کمرے میں جھانک رہی تھی . جب وہ پوری طرح تیار ہو گئی تو ثانیہ باقاعدہ اسے سراہنے اندر چلی آئی . اتنے میں عروج بھی آ گئی.

"ہائے باجی! کتنی پیاری لگ رہی ہیں آپ . وہ لوگ تو آج ہی آپ کو ساتھ لیجانا چاہیں گے". ثانیہ نے تھالی بجائی . سنایا نے ایک نظر عروج کو دیکھا جو اسے ہی دیکھے جا رہی تھی.

" کون لوگ؟" سنایا کو لگا جیسے اس کے خدشات غلط نہیں تھے.

"اف! وہ ہی ..باقر انکل کے دوست کی فیملی. آپ کو دیکھنے آرہے ہیں نہ وہ لوگ". کہہ کر ثانیہ ہنستے ہوئے وہاں سے چلی گئی.

"میں جانتی تھی کہ ایسا ہی کچھ پروگرام ہے" وہ نڈھال ہوکر بیڈ پر بیٹھ گئی.

"تمہارے گھر والے بہت خوش ہیں سنایا".. وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے کہہ رہی تھی . اس کے چند الفاظ بہت کچھ کہہ گئے تھے . سنایا آنکھیں پھاڑی اسے دیکھنے لگی.

"ابھی تک ادھر ہی ہو؟ مہمان آگئے ہیں بیٹا". ممی نے آتے ہی کہا . بیٹی پر صرف ایک ہی نظر ڈالی تھی کہیں انہی کی نظر نہ لگ جائے۔

"یہ ثانیہ کہہ رہی تھی کی باقر انکل کے دوست کی فیملی"... اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی.

"ہاں وہ لوگ بھی آے ہیں". ممی نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی" . عروج ذرا اسے لیکر بہار آنا". وہ کہہ کر چلی گئیں.

"اب چلو بھی". عروج اسے تقریباً ڈھکیلتی ہوئی باہر لے آئی . اسے آتا دیکھ ثانیہ اس کے قریب آئی" . میرے ہونے والے جیجا جی بھی آئے ہیں . بہت ہی ہنڈسم ہیں" ثانیہ کی خوشی دیدنی تھی.

وہ اپنے کزنس سے ملکر ایک کونے میں بیٹھ گئی .

"اب آگے کیا سوچا ہے آپ نے؟" اس کی کزن نے اسے پاس ہونے کی مبارک باد دیکر سوال کیا.

"ابھی کچھ سوچا نہیں ہے". اس نے بیزاری سے جواب دیا.

احمد علی برقی اعظمی ۔ دہلی

غزل سہل ممتنع

آزمودہ کو آزماتے کیا ؟
موت کو ہم گلے لگاتے کیا ؟
دی ہے ہم کو خدا نے عقلِ سلیم
نہ کماتے اگر تو کھاتے کیا ؟
ہے یہ مخصوص جانِ جاں کے لئے
جان و دل غیر پر لٹاتے کیا ؟
دیکھ کر اس کو در پئے آزار
گر نہ روتے تو مسکراتے کیا ؟
کام مجھ سے اگر نہیں ہوتا
میرے گھر یونہی آتے جاتے کیا ؟
رقص کرنا جنہیں نہیں آتا
انگلیوں پر انھیں نچاتے کیا ؟
ہم کو تفریح کا نہیں کیا حق ؟
بارِ غم عمر بھر اٹھاتے کیا ؟
ہیں جو اپنے وجود کا حصہ
ان کو ہم یونہی بھول جاتے کیا ؟
ہم ہیں ان کے مزاج سے واقف
مانتے گر نہ وہ مناتے کیا ؟
نعمت حق کا شکر ہے واجب
عاقبت اپنی ہم گنواتے کیا ؟
برق باقی کے آگے پیچھے تھی
خانہء دل کو وہ سجاتے کیا ؟

نواز احمد ریسرچ اسکالر۔ای۔ایف۔ایل یونیورسٹی، حیدرآباد

بین القصرین (عربی ناول) تجزیاتی مطالعہ کے آئینے میں

یوں تو نجیب محفوظ کے معرکۃ الآراء قلم سے بہت سے لاجواب ناول زینت قرطاس بنے، لیکن ان میں (بین القصرین) اپنے پارٹ وکردار میں منفرد مقام رکھتا ہے، یہ محض ایک ناول نہیں کہ صاحب تحریر نے زبان کے چٹخارے لئے ہوں، فکر وفن کے قلابے ملائے ہوں، بلکہ یہ اپنے اندر مصری تاریخ کا ایک جہاں سمائے ہے، طرز بود وباش سے سیاست کے اتار چڑھاؤ اور مدوز جر تک انقلاب کی کہانیوں کے مندرجات اس میں تحریر ہیں۔

یہ ناول شہر قاہرہ کی قومی وقدیم شاہراہ پر بسے ایک متوسط خاندان کی کہانی سے شروع ہوتا ہے جس میں ایک سربراہ خانہ ہے جس کا نام (سید احمد عبدالجود) ہے، جس کا مزاج انتہائی سخت، تلخ و ترش ہے، اس کے ذوق وفکر کے خلاف کچھ کرنا اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنا ہے، سارا خاندان اسی کے رعب میں ہے، غرض درخانہ اسی کے حکم سے دروازے کھلتے اور زنجیریں کٹتی ہیں، اس خاندان میں اہلیہ امینہ بھی ہیں جو شادی کے بعد سے اب تک گھر کی دہلیز تک کو پار کرنے میں جواد صاحب کے حکم کی محتاج ہیں، جو قاہرہ شہر میں ہوتے ہوئے بھی قاہرہ سے بے خبر ہیں، جہاں کی گلیوں، چوراہوں سے اسے کوئی لینا دینا نہیں غضب یہ ہے کہ وہ اپنے ہی شوہر کی مارکیٹ سے واقف نہیں، وہ گھر سے دس منٹ کی دوری تک بھی اپنی مرضی سے نہیں جاسکتی، اس کی شادی کو بیس سال ہو چکے ہیں، لیکن گھر سے باہر جانے کی خواہش میں ہمیشہ اس کا خوفناک شوہر آڑے آتا، اس کی ساری تگ ودو گھر کے اندر ہے۔ اس خاندان میں ان دونوں کے تین بیٹے ہیں یاسین، فہمی اور کمال اور دو بیٹیاں ہیں جن کا نام خدیجہ وعائشہ ہے، ان کی شادی جواد صاحب کی پسند سے طے ہوئی ہیں، جواد صاحب متقی وپرہیز گار ہیں، نمازی ہیں خدا کے قہر و غضب سے ڈرتے ہیں باہر خوش اخلاق ہیں لیکن گھر پہ معتدل نہیں، بچوں سے پسند ناپسند پوچھتے ہیں قدیم رسوم ورواج اور روایات واخلاق پر مصر ہیں، بچے باپ سے سامنے ڈرتے ہیں پر پس پردہ عشق ومعاشقہ جاری ہے۔ یاسین جواد صاحب کی پہلی بیوی کی یادگار ہے، جیسے انہوں نے طلاق دے دی تھی، یاسین ہوس کی تکمیل کے سامان تلاشتا پھرتا ہے، عائشہ قریب البلوغ ہے، وہ بھی ایک آفیسر پر فدا ہے اور اس کے راستے دیکھتی ہے گھنٹوں دروازے کی اوٹ سے اس کے ایک جھلک پانے کی متمنی ہے، فہمی کمال کے ساتھ چھت پر سبق کا اعادہ کر رہا ہے کہ کوئی حسینہ چھت پر نمودار ہوئی کہ اس سے آنکھیں چار کرنے لگا۔

ناول کے ابواب کے مابین جواد صاحب کی شخصیت دھیرے دھیرے نکھرتی جاتی ہے، سارے سیاق وسباق سے پتا چلتا ہے کہ اس سخت گیر اور قدیم روایات کے فرسودہ والد کی ساری توجہ فیملی کو اپنے ماتحت رکھنے میں ہے، وہ اسی کو اپنی عزت وشرافت اور اخلاقی کمال سمجھتا ہے، کہ بچے چوں چراں نہ کریں، سر نہ اٹھائیں، اس کے ہر فکر وسوچ اور فہم کی تکمیل کے لیے دوڑتے پھریں، بیوی خدمت گزاری میں لگی رہے، اس کے لیے جواد صاحب گھر کے اندر کبھی ہنستے نہیں، مزاح نہیں کرتے کہ بیوی بچے سر پر سوار نہ ہو جائیں، نجیب کی نظر میں جواد صاحب کی یہ کمزوری ہے، جو تربیت میں منافی ہے، سختی اور بے جا قدیم روایات پر اصرار سے وہ اپنی فطری وحقیقی شخصیت کو چھپا رہا ہے، جو کسی طور مناسب نہیں، فطرت کو دبانے سے فطرت نہیں دبتی،

فطرت کو تربیت کے دائرے میں لانا ہوتا ہے، نجیب کہتا ہے کہ اگر جواد صاحب دباؤ کے بجائے ڈھیل دے کر تربیت کرتے مناسب ہوتا، پھر بچے یوں چھپ چھپ ہوس کی تکمیل کو نا دوڑتے، یاسین، فہمی، کمال و عائشہ یوں عشق و معاشقے لڑاتے نہ پھرتے۔

نجیب محفوظ کے اس ناول سے جہاں جواد صاحب کی سخت گیری کا پتہ چلتا ہے، وہیں سیاست اور سیاسی خبروں کے بھی وہ رسیا ہیں، سیاست میں بھی ان کا مزاج فرسودہ ہے، وہ ظلم و زیادتی اور حقوق غصبی کے لئے اپنے لوگوں کو ذمہ دار سمجھتا ہے، ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے، سیاست سے ٹکرانے کو حرام سمجھتا ہے، اور اسے وہ وطن پرستی اور وطن دوستی کے طور پر پیش کرتا ہے، اپنا یہ مزاج بھی وہ افراد خانہ پر مڑھنا چاہتا ہے، سیاست کے معاملے میں بھی افراد خانہ میں تضاد ہے، سربراہ خانہ کے نظریات جدا ہیں، جب کہ ایک بیٹا جس کا نام فہمی ہے اسکی سرگرمیاں جدا، یہ ناول خاندان کی اس سیاسی چپقلش کے ساتھ ساتھ سیاست کے ساتھ انکی گہرائی، رابطہ اور جوڑ کا بھی بتدریج تذکرہ کرتا ہے۔ فہمی کی سیاسی سرگرمیاں کیا اور کیسی تھیں؟ افراد خانہ کی اس سیاسی تضاد کا نتیجہ کیا کچھ برآمد ہوا، ان سب کی گرہ کشائی ہوتی ہے۔

فہمی کی سیاست میں انٹری پڑھائی کے دوران ہی ہو جاتی ہے، وہ طلباء کمیٹی کا رکن بنتا ہے، ۱۹۱۹ء کی بغاوت کے موقع پر اس کے کئی خفیہ تنظیموں سے رابطے اور رکنیت اس کے پاس ہوتی ہے، دراصل فہمی والد صاحب کے مقابلے مصری سرزمیں پر امن و نظام کے لیے اسلامی خلافت اور گورنر عباس کی واپسی پر یقین رکھتا ہے، اسے پورا یقین ہے کہ یہی وہ جماعت ہے جو مصری باشندوں کی غلامی کے طوق کی کرچیاں بکھیر سکتی ہے، اور مصر کو مکمل اور پائدار آزادی فراہم کر سکتی ہے، جب کے سخت گیر والد اس قدم کو بغاوت کہتا ہے یہ عمل اس کے نزدیک وطن پرستی کے مخالف ہے، وطن سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ چپ چاپ نظریں جھکائے بیٹھے رہو، چناچہ باپ بیٹے کے جداگانہ سیاسی نظریات نے گھر کے اندر ہی معرکہ بپا کر دیا، والد کی رائے، سوچ و فکر کے خلاف ہونا چناچہ نافرمانی تصور ہوتا تھا، اس لئے والد محترم فہمی کو اس کے نظریات کے تضاد کی وجہ سے نافرمان قرار دے رہے ہیں، وہ افراد خانہ کو الگ رجحانات و نظریات کے بھیانک انجام کا بتاتے ہوئے انہیں اندھی تقلید پر راغب کرتا ہے، فہمی جو اب سیاست میں تقریبا بالغ ہو چکا ہے، وہ والد کے شدید غصے کے باوجود اپنے نظریات پر قائم ہے، اور دلیلیں دیئے جا رہا ہے، اندرون خانہ یہ پہلا موقع ہے جب سربراہ خانہ مبہوت ہے، بے بس ہے، مجبور ہے، وہ اس خاندانی بغاوت کو کچلنے پر قادر نہیں، اور یہ پہلی مرتبہ ہے جب فہمی اس خاندانی اندھی تقلیدی خول کو توڑنے پر قادر ہوا، سوچ و فکر کے سانچوں کے بدلنے سے حالات، واقعات، اور سیاست کیسے بدلتی ہے، یہ آپ اس ناول سے خصوصی طور پر اخذ کر سکتے ہیں کہ جو چیز جواد صاحب کے نزدیک بغاوت تھی، وہی فہمی کے نزدیک انقلاب، جسے جواد صاحب وطن دشمنی گردانتے تھے فہمی اسی کو عین وطن پرستی اور محبت وطن کہتا تھا، انقلاب کی روداد کو بیان کرتے ہوئے نجیب محفوظ تفصیل سے لکھتے ہیں کہ وہ مصر میں پھیلی انارکی، بے ضابطگی و بے قاعدگی سے تنگ تھا، باشندگان مصر پر انگریزی حکومت اس کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی، وہ آئے روز کے مظالم سے سخت غصے میں تھا، وہ مصر کو آزاد کروانا چاہتا تھا، اس نے مصر کو ایک نیا ملک سمجھا، انقلاب نے اس کی روح و وجدان کو نئی سمت عطا کی، انقلاب اس کا مقصد تھا، وہ سعد زغلول پر قہر بن کر ٹوٹنا چاہتا تھا، اور مصر کو ان کے ناپاک سایوں سے بچانے کی سعی کر رہا تھا، چنانچہ دو مظاہرے ہوئے اور وہ ان کے شانہ بشانہ تھا، اس کا ذہن مزید انقلاب کا متمنی رہا۔

فہمی کی سعید قسمت کے ایک تو وہ طالبعلم تھا، دوسرے اس کا مرکز علم وہی مدرسہ تھا جس نے انقلاب کے شعلے کو بلندی فراہم کی وہ جماعت طلبہ کا ہیڈ تھا، اور فرنٹ سے اس سارے انقلاب کو لیڈ

کر رہا تھا، اس کا جوش وجنون بڑھتا رہا اس نے قیادت کے جھنڈے کی حفاظت پر ساری توانائی صرف کی، وہ صفوں سے بہت آگے نکل چکا تھا، اس کی تڑپ ولگن اور جان ہتھیلی پر لئے پھرنے کی عادت بہت آگے لے جا چکی تھی، یہی سب چل رہا تھا کہ یکا یک نیا موڑ آیا اور انقلابی جد و جہد کے ایک مظاہرے کی قیادت کا عمل اسے جام شہادت پلا گیا فہمی کی موت پر ناول اختتام کو پہنچتا ہے۔

نجیب محفوظ اپنے اس ناول میں ایک ایسے ناول نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں جو واقعات کی پوری امانت کے ساتھ تصویر کشی کرتا ہے، اور اپنے ناولز کے ہیرو سے ایسے زندہ شخصیتوں کو وجود دیتا ہے جو مکمل زندگی گزارتی ہیں۔ اور جو جذبات اور خواہشات سے بھرپور مکمل زندگی گزارتے ہیں۔ اور وہ ان چند ناول نگاروں میں سے ایک ہیں جو انسانیت کی ایسی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں جس میں کبھی کبھی غیر انسانی حالات بھی پیش آتے ہیں۔ اور جس معاشرے میں عورتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، یا ایسے انسان کے طور پر ہوتی ہے جسکا اپنا کوئی ارادہ اور خواہش نہیں ہوتی، گویا اسکی حیثیت صرف ایک ایسی جنسی کی ہوتی ہے جو اگر بیوی بن جائے تو ایک کارخانہ میں تبدیل ہو جاتی ہے، جسکا کام صرف بچہ پیدا کرنا ہے، گھر کی خدمت کرنا، اور شوہر کی غلامی کرنا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نجیب محفوظ مصر کے متوسط طبقہ کے کاتب ہیں، پھر اس ناول میں انہوں نے بہت سارے طبقات میں سے متوسط طبقہ کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے، جس طبقہ نے مصری بغاوت میں حصہ لیا ہے۔، چنانچہ نجیب نے تاجر احمد عبد الجواد اور انکے پڑھے لکھے بیٹے فہمی کو اپنی ناول کے ہیرو کے طور پر پیش کیا ہے، کیونکہ اس زمانے میں طلبہ ہی انقلاب کے علمبردار ہوا کرتے تھے اور جلا بخشنے کا کام کرتے تھے، ان میں سے اکثریت ایسے طبقہ سے تعلق رکھتی تھی جو اپنے بچوں کی تعلیم پر خرچ کرنے کی قدرت رکھتے تھے، نجیب محفوظ کا اسلوب تنقیدی حقائق سے بھرپور ہے، جسکی وجہ سے انکو مصر کے متوسط طبقہ کی تصویر کشی کرنے میں آسانی ہوئی، اور وہ ہمارے لئے مصری معاشرہ اور اس وقت کی تاریخ کو سمجھنے میں ممد معاون ثابت ہوئے۔

سیدہ تبسم ۔ ممبئی

غزل

راہ تکتی ہوں تری میں مرے ساجن کب سے
سونا سونا ہے مری باہوں کا آنگن کب سے

مجھ کو گڑیا کی طرح رکھتے تھے ماں باپ مرے
ہر گھڑی مجھ کو بلاتا ہے وہ بچپن کب سے

تو جو آجائے یہاں تو میں اتاروں اس کو
پیار کا تیرے لگا رکھا ہے ابٹن کب سے

منتظر ہوں میں تری ہاتھ ہے ننگے میرے
مانگتے ہیں یہ ترے پیا کا کنگن کب سے

کس کے مل جانے سے چنچل تو ہوئی ہے اتنی
تجھ میں پیدا ہوا اتنا یہ لڑکپن کب سے

کب سے جذبات کو تم قید کئے بیٹھے ہو
ٹوٹنے کے لئے بے چین ہے بندھن کب سے

جس کے آنے سے تبسم تو ہوئی ہے زندہ
اس کے خوابوں کا تری آنکھیں ہیں مسکن کب سے

عائشہ جی بی۔حیدرآباد

''کرنول کے نوابوں کی تاریخ'' ایک مختصر جائزہ

آندھراپردیش کا نقشہ

آندھراپردیش کا پہلا دارالخلافہ کرنول تھا۔یکم/نومبر 1956ء کو آندھراپردیش کا صدر مقام کرنول کو بنایا گیا تھا۔ کرنول رائل سیما کا ایک ایسا شہر ہے جسے گیٹ وے آف ''رائل سیما'' کہا جاتا ہے۔کرنول میں کئی مسلم نوابوں نے حکمرانی کی ہے۔ یہ شہر تاریخی شہر مانا جاتا ہے۔کیوں کہ یہ شہر عرصۂ دراز تک مملکت آصفیہ کا حصہ تھا۔نواب میر قمرالدین خان بانی سلطنتِ آصفیہ نے ایک پٹھان خاندان کو اس علاقے کا گورنر بنایا تھا۔آصف جاہ اول کے بعد جانشینی اور خونریزی کی جنگ اس علاقے میں ہوئی تھی۔نواب ناصر جنگ کو میدان میں کرنول کے نواب ہی نے شہید کیا تھا۔

تاریخ گواہ ہے کہ حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کی فوجوں نے ہی یہاں پر حملے کیے تھے۔ایسٹ انڈیا کمپنی کا جب جنوبی ہند پر تسلط ہوگیا تو یہ علاقہ انگریزوں کی عمل داری میں موجود تھا۔ ان سبھی جنگوں اور حالتوں سے پتہ چلتا ہے کہ کرنول ایک تاریخی شہر کے نام سے جانے جاتا ہے۔کرنول کے عوام ہمیشہ زمانے کے سرد گرم حکومتوں کو برداشت کرتے رہے تھے۔

جنگ آزادی میں کرنول کی پٹھان ریاست نے بھی کارنامے انجام دیے تھے۔انگریزوں کا اقتدار جنوبی ہند میں بھی قائم ہوا۔

کرنول افغانی نسل، گھڑسواروں، توپ چلانے والوں اور سپاہیوں کا مرکز تھا۔ جنگ آزادی میں شہید ہونے کا اعزاز کرنول کے آخری نواب غلام رسول خان پنی کے مقدر میں تھا۔

کرنول انگریزوں کی فوج کے گرفت میں آگیا۔ لیکن پٹھانوں نے اپنے ہتھیار واپس کرنے سے انکار کردیا اور پٹھانوں کی مکمل تعداد ایک ساتھ شہید ہوگئی۔ اور اپنی جانیں قربان کرڈالی۔

کرنول پر کئی نوابوں کی حکومت تھی جن میں محمد خان، سرفراز خان، قلی خان، نیک نام خان، نیک نیت خان وغیرہ تھے۔کرنول کے نواب حاکم یا گورنر کہلاتے تھے۔

مغلیہ سلطنت کے آخری حکمراں کے بعد کرنول کے نوابوں کی ایک لمبی فہرست ملتی ہے۔جن میں:

(1) نواب داؤد خان پنی (2) نواب ابراہیم خان پنی (3) نواب الف خان کلاں (4) نواب محمد بہادر خان (5) نواب رستم خان (6) نواب محمد منور خان اور (7) نواب محمد غلام رسول خان کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

کرنول تاریخی شہر اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہاں پر نواب عبدالوہاب کی گنبد، کنڈہ ریڈی برج، انگریزوں کے زمانے کی تعمیرات، عربی ڈگری کالج، گولس کالج، عثمانیہ کالج وغیرہ وغیرہ ان عمارتوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ انگریزوں کی تعمیر کنندہ عمارتیں ہیں۔

کرنول کی تاریخ گواہ ہے کہ نواب عبدالوہاب کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ان کی تعمیر کردہ عالیشان گنبد کی وجہ سے۔ یہ گنبد 400 سال پرانی ہے۔اس عمارت کو دیکھنے آج

بھی لوگ شہر کرنول آیا کرتے ہیں۔ کرنول کے پہلے حکمراں نواب عبدالوہاب عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ عبدالوہاب کا زمانہ شاہ جہاں کے دور کا زمانہ تھا، جو جنگ تالی کوٹہ 1565ء میں لڑی گئی تھی۔ اس جنگ میں سلطان ابراہیم قطب شاہ اور علی عادل شاہ بیجاپور نے متحد ہوکر راجہ کے ساتھ مقابلہ کیا تھا۔ راجہ کے مارے جانے کے بعد ہمپی کی سلطنت کا خاتمہ پر کرنول کا علاقہ علی عادل شاہ کے حصہ میں آیا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ نے عبدالوہاب کو کرنول بھیج کر اس پر قبضہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس کے کہنے پر عبدالوہاب ایک بڑی فوج کو اپنے ساتھ لے کر کرنول پہنچا۔ فوج کے ساتھ اس نے چند اولیاء اکرام کو بھی اپنے ساتھ کرنول لے گیا تھا۔ کرنول میں اس وقت راجہ گوپال کی حکومت جو راجہ راما راؤ کا پوتا تھا۔ کرنول کے سرحد میں داخل ہوکر عبدالوہاب نے خیمے گاڑھے۔

ظہر کی نماز کا وقت آیا تو مؤذن نے اذان بلند کی یہ آواز اذان کی دور دور تک پہنچی تب راجہ گوپال محل میں سو رہا تھا تب اذاں کی آواز اس کے کانوں تک پہنچی تو اس کا دل دھڑک اٹھا اور مارے ڈر کے وہ دروازے سے فرار ہوگیا اور بھاگتا ہوا عالمپور پہنچا اور وہیں رہنے لگا۔

عبدالوہاب کو پتہ چلا کہ راجہ گوپال بھاگ کے عالمپور میں چھپ گیا ہے تو وہ کرنول میں داخل ہوا اور قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ اس کی خبر ابراہیم عادل شاہ کو پہنچی تو وہ نواب عبدالوہاب کو کرنول کے حاکم کے طور پر مقرر کردیا۔

نواب عبدالوہاب کرنول کا حاکم مقرر ہونے کے بعد اس نے کسی مندر کو بھی مسمار کا ارادہ نہیں کیا۔ نواب بہت ہی بہادر انسان تھا جب جنگ میں شامل ہوتا تو مقابلہ ڈٹ کے کیا کرتا تھا۔ اگر وہ رہتا تو گوپال راجہ کو گرفتار کرکے قید کرلیتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا راجہ کی جان بخش دی۔

نواب عبدالوہاب کے پیرو مرشد حضرت سید شاہ کریم اللہ شاہ قادری تھے۔ اس نے اپنے پیرومرشد کے لیے ایک عالیشان گنبد تعمیر کی۔ تعمیر ہونے کے بعد اپنے پیرومرشد سے عرض کیا کہ یہ گنبد میں نے آپ کی خاطر بنوایا ہے تو مرشد پاک قبول نہیں فرمائے۔

نواب کی عادت تھی کہ آپ مزدوروں کی مزدوری فوراً ہی ادا کردیتے تھے۔ اگر عورت حاملہ مزدور ہوتو اس کی مزدوری دوگنی مزدوری مل جاتی تھی۔

نواب عبدالوہاب مسلسل 16 سال تک کرنول کے حکمراں رہے۔ اس زمانے میں کرنول کو بے حد ترقی ہوئی اور کرنول ایک ایسا تجارتی مرکز بنا۔ رعایا کے لیے اعلیٰ انتظام کیا اپنے اسی انصاف کی وجہ سے مقبول ہوئے۔ آخر کار نواب عبدالوہاب اپنے نیک نامی کے ساتھ 1640ء میں اس دارِ فانی سے کوچ کرگئے۔ ہندری ندی کے کنارے آپ کا گنبد اپنی قدیم تاریخی طرزِ تعمیر کے لیے اپنی مثال آپ ہے۔ نواب عبدالوہاب اور ان کے بھائی اس یادگار گنبد میں آرام فرما ہیں اور ان کے پیرومرشد حضرت سید کریم اللہ شاہ قادریؒ کی درگاہِ شریف نواب عبدالوہاب کے گنبد سے قریب ہے۔ ان کی زیارت گاہ بہت ہی خاص بنی ہوئی ہے۔

عادل شاہی گورنر کے کارناموں کو ہمیشہ یاد کرتی رہے گی۔ عبدالوہاب کے بعد ان کے بھائی محمد خان کرنول کے گورنر بنے گنبد میں عبدالوہاب خان کے بھائی محمد خان اور دیگر نوابانِ کرنول آرام فرما ہیں۔ بیجاپور کی طرز تعمیر کے وقت مشتمل گنبد عبدالوہاب خان آج کل آثار قدیمہ کی زیرنگرانی بنی ہوئی ہے۔ عبدالوہاب خان اور بعد محمد خان کے بعد نواب خضر خان پٹنی (1684ء) اورنگ زیب کی طرف سے کرنول کی صوبیداری کے لیے آئے۔ کرنول پر پٹنی خاندان کا اقتدار قائم ہوا۔

1775ء میں ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی نے جب کرنول پر حملہ کیا تو اس وقت کرنول پر حکمران نواب منور خان تھے۔ منور خان کے بعد ان کے تیسرے فرزند الف خان ثانی نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی تو کرنول کا سیاسی سماجی ماحول بہت ہی خوشنما تھا۔

مشہور صوفی حضرت رحمت اللہ تارک الدنیا ہونے سے پہلے الف خان ہی کے ملازم تھے۔ بارش نہ ہونے کی وجہ سے ہر طرف بدحالی تھی۔ عوام کے ساتھ ساتھ نواب الف خان بہت پریشان رہا کرتے تھے۔ نواب کو کسی نے مشورہ دیا کہ حضرت رحمت اللہؒ سے بارش کی دعا کے لیے درخواست کیجیے۔

پنی خاندان تقریباً تین سو برس کرنول پر حکمران رہی:

1۔	خضر خان پنی	:	1652ء تا 1675ء
2۔	داؤد خان	:	1675ء تا 1714ء
3۔	علی خان (المعروف رنمست خان کلاں)	:	1714ء تا 1719ء
4۔	ابراہیم خان (المعروف بہادر خان پنی)	:	1719ء تا 1733ء
5۔	الف خان اول	:	1733ء تا 1746ء
6۔	ہمت خان	:	1746ء تا 1750ء
7۔	منور خان (المعروف رنمست خان)	:	1750ء تا 1792ء
8۔	الف کان ثانی (المعروف الفت خان پنی)	:	1792ء تا 1833ء
9۔	غلام رسول خان پنی	:	1833ء تا 1839ء

خواجہ رحمت اللہ نواب کی بات سن کر جیسے ہی دعا کی بادل بھر آئے اور بارش شروع ہوگئی۔ الف خان کو بھیگتے ہوئے واپس جانا پڑا۔ الف خان حضرت سے بہت متاثر ہوئے۔ اور اپنی دختر حبیب النساء کو خواجہ رحمت اللہؒ کے عقد میں دینے کا فیصلہ کرلیا۔ الف خان کی حق شناسی اور خدا ترسی کے ساتھ ساتھ ان کی اردو نوازی بھی بھی تاریخ کے صفحات پر مشتمل ہے۔

الف خان کے بعد ان کے چھٹے فرزند غلام رسول خان پنی کا دور تھا۔ غلام رسول خان (1833ء تا 1839ء) میں صرف پانچ سال حکمران رہے۔ ان پانچ برسوں میں آپ کی فہم و فراست، دلیری، بہادری، حق شناسی، وحق جوئی، حق گوئی و بے باکی کی فیاضی کے بارے میں لوگ کہنے لگے اور یہاں کے عوام کے زبان پر بھی یہ بول ہمیشہ کے لیے تھے۔ خوش قسمت تھے لوگ جو ایسا حاکم بیٹھنے کے بعد راحت پائی۔ امیر ابن الامیر کریم ابن الکریم نواب غلام رسول خان صاحب بہادر محمود معاون ثابت ہوئے۔ غلام رسول خان کو آزادی پسند کے مرد مجاہد کے نام سے بھی یاد کیا جانے لگا۔ کیوں کہ اپنے دورِ اقتدار میں آپ نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت آواز بلند کی۔ اس کی وجہ سے نواب غلام رسول خان پنی کا نام مجاہدین آزادی کی فہرست میں لکھا جانے لگا۔

جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''غلام رسول خان کرنول کے آخری تاجدار تھے۔ اور راقم کے دل میں ان کا وہی مقام ہے جو حیدر علی، ٹیپو سلطان، نانا فرنویس یا جھانسی کی رانی کا ہے۔ 1839ء میں غلام رسول خان نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی اسکیم بنائی اور اس اسکیم کے تحت ایک زمین دوز اسلحہ خانہ اور بارود خانہ (کونڈا ریڈی برج) قائم کیا گیا لیکن وقت سے پہلے یہ راز فاش ہوگیا۔ غلام رسول خان گرفتار ہوگئے اور ریاست کو انگریزی عملداری میں

شامل کرلیا۔اس وقت بھی اگر چہ جانباز سپاہیوں نے جنگ شروع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن غلام رسول خان کو چوں کہ رعایا کا خون ناحق گوارانہ تھا انہوں نے یہ کہہ کر اب فتح کا امکان باقی نہیں رہا، اس امر کی اجازت نہ دی۔ بعد میں غلام رسول خان رہا ہو کر ترچنا پلی چلے گئے یہاں اپنے ہی ایک سپاہی کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ وہاں ان کی قبر آج بھی موجود ہے۔''

(قیسی قمر نگری ''کرنول میں اردو شعر و ادب'' صفحہ نمبر:30)

(بقیہ ص:۴۲ رکا).....

ان کے بے شمار مضامین اب تک اردو ہے ہی نہیں بلکہ ہندی میں بھی رسائل وجرائد کی زینت بنتے رہتے ہیں، وہ نہ صرف مضمون بلکہ فکشن میں بھی دست آزمائی کرتی رہتی ہے۔ان کے افسانے، ڈرامے، بچوں کی کہانیاں اور ان پر مضامین بھی لکھتی رہتی ہیں۔ڈراما علامہ کے علاوہ صالحہ صدیقی کی مشہور تصانیف میں اردو ادب میں تانیثیت کی مختلف جہتیں، ضیائے اردو، سورج ڈوب گیا، نیاز نامہ قابل ذکر ہیں۔ڈراما ''علامہ'' ہندی ترجمہ بھی منظر عام پر آچکا ہے۔صالحہ صدیقی کی کتابوں اور ان کی ادبی خدمات کے لیے کئی انعامات سے نوازا جا چکا ہے، ان کی کتاب ڈراما ''علامہ'' اور ''نیاز نامہ'' کے لیے اتر پردیش اردو اکیڈمی کی طرف سے انعام دیا گیا، اس کے علاوہ احمد نگر ضلع اردو ساہتیہ پریشد نے انھیں ''اردو خدمت گار ایوارڈ'' ہلپ کیئر فاؤنڈیشن نے انھیں ''جہانگیر لٹریری ایوارڈ'' سے نوازا۔صالحہ صدیقی ''ضیائے حق فاؤنڈیشن'' کی چیئر مین ہے۔اس فاونڈیشن کا مقصد لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اور اردو زبان کو فروغ دینا ہے۔اس کے علاوہ وہ کئی ادبی تنظیموں سے وابستہ ہے۔وہ مختلف ادبی پروگراموں اور سرگرمیوں میں مصروف رہتی ہیں۔ڈراما علامہ کے سلسلے میں فکشن کی دنیا کی نامور ہستی پروفیسر خالد جاوید لکھتے ہیں ''اس ڈرامے سے صالحہ صدیقی کی تخلیقی صلاحیتوں کا حیرت انگیز انکشاف ہوتا ہے۔'' امید کہ وہ آئندہ بھی ڈرامے کے اس سلسلے کو رواں رکھیں گی، آج ہمارے اردو ادب میں ڈراما لکھنے کا چلن کم ہوتا جا رہا ہیں، امید ہے ادبی حلقوں میں اس ڈرامے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور مطالعے کے ساتھ اسٹیج کا بھی جزو بھی بنایا جائے گا۔

عبد المنان صمدی۔علی گڑھ

غزل

بہت راحت ملی جب تک رہے کچے مکانوں میں
کہاں آکر مقید ہو گئے ہم سائبانوں میں

ہمیں دیکھو کہ ہم کیا ہیں ہماری عمر کتنی ہیں !
ہم اپنا خوں پسینہ بیچ آئے کارخانوں میں

بلندی سے جنہیں پھیکا گیا تھا آن واحد میں
انہی کے آج چرچے ہو رہے ہیں آسمانوں میں

کہیں ہندی، کہیں اردو، کہیں انگریزی ہے رائج
مرے مولا یہ دنیا بٹ گئی کتنی زبانوں میں

نہیں تقدیر سے شکوہ نہیں کوئی گِلہ ہم کو
رہیں ہم جھونپڑوں یا رہیں کچے مکانوں میں

عبد القوی ذکی حسامی۔ امام وخطیب مسجد لطف اللہ دھاتو نگر حیدرآباد

دلِ مردہ دل نہیں، اسے زندہ کردوبارہ

اللہ رب العزت نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا، اسکو اشرف المخلوقات کا طمغہ دیا، انسان کی خلقت وبناوٹ میں اپنی قدرت کے انمول نظارے جلوہ گر کیا، اور یہ انسان دو چیزوں کا مرکب ہے، جسم اور روح۔ جسم اور روح کے درمیان بڑا گہرا رشتہ ہے، دونوں ساتھ رہیں تو زندگی، جدا ہوجائیں تو موت، ان دو عنصروں سے انسان کا تعارف ہے، دونوں کی نشوونمائی مختلف، دونوں کی غذا اور تروتازگی کی راہیں مختلف، دونوں کے سامانِ تسکین مختلف ہے، جسم کا تعلق ظاہر سے ہے، روح کا باطن سے ہے، ایک ظاہر کی زندگی اور موت ہے، ایک باطن کی زندگی اور موت، جس طرح دل کی تین رگیں مفلوج ہوجائے تو ظاہر کی موت کا پتہ چلتا ہے، اسی طرح تین جگہوں پر اپنے دل (روح) کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ آیا وہ زندہ ہے یا مردہ۔ اور یہی وہ روح ہے جس سے انسان کو خداشناسی ہوتی ہے، اسی سے انسان، انسان ہوتا ہے۔

تین باتیں جس سے دل مردہ ہے یا زندہ! معلوم ہوجاتا ہے۔

یقول الصحابی الجلیل عبد اللہ بن مسعودؓ اطلب قلبک فی ثلث مواطن ۱.عند سماع القرآن ۲.وفی مجلس الذکر ۳. وفی وقت الخلوۃ. فان لم تجدہ فی ھذہ المواطن ،فاعلم انہ لا قلب لک فسئل اللہ قلبا آخر . حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے دریافت کیا گیا کہ دل اچھا ہے یا مردہ کیسے معلوم کیا جائے؟ آپؓ نے فرمایا تین جگہوں پر اپنے کی دل کی جانچ کرو تمہارا دل مطمئن ہے تو سمجھ لو کہ دل زندہ ہے، اگر نہیں تو جان لو کہ مردہ ہوگیا ہے اللہ دوسرے کا سوال کرو۔ وہ تین مواقع یہ ہیں۔ ۱۔قرآن مجید کی سماعت کے وقت ۲۔ذکر کی مجلس میں ۳۔خلوت میں خداخوف۔

۱۔قرآن کی سماعت۔

سب سے پہلی چیز قرآن مجید کی سماعت ہے، قرآن مجید دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جو آج بھی اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے، اور کیوں نہ جسکی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لے رکھا ہے **انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون.** (القرآن پ ۱۴) اسکی طرف منسوب ہر عمل باعث اجر وثواب ہے، اس کتاب کا پڑھنا، سننا، سمجھنا، غور وفکر کرنا، تعلیم وتعلم کرنا، جہاں اخروی اعتبار سے فائدہ مند ہے، وہیں دنیوی لحاظ سے باعث خیر وبرکت اور سامانِ تسکین قلب ہے، قرآن مجید کتاب ہدایت ہے، اس کتاب سے ہدایت اسے ہی نصیب ہوتی جو اس کا قدرداں اور طالب ہدیٰ ہو، جو اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوگا اس کیلئے حجت بنے گا، اور اگر کوئی اس سے روگردانی کرے یعنی اسکی تعلیمات پر عمل آوری نہ کرے ان کے خلاف بروز قیامت گواہی دے گا، مولانا علی میاں ندویؒ فرماتے ہیں کہ تین باتیں ایسی ہیں وہ اگر مسلمانوں میں بھی پائی جائیں تو کلام اللہ سے استفادہ ممکن نہیں۔ وہ تین باتیں یہ ہیں ۔۱۔تکبر ۲۔قرآن مجید میں بغیر علم کے مجادلہ کرنا ۳۔انکار آخرت اور دنیا پرستی (مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی)

ذرا ہم اپنے اسلاف کی زندگیوں کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ وہ کس قدر قرآن کے قدرداں تھے، امام اسماعیلیؒ کی موت اس حالت میں آئی کہ وہ محراب مسجد میں محو تلاوت تھے، اسی طرح امام عبد

اللہ بن ادریسؒ جب ان کی موت کے آثار شروع ہوئے تو بیٹی دیکھے کر رونے لگی انہوں نے فرمایا بیٹی مت رو، تیرے باپ نے ۴ ہزار قرآن ختم کئے ہیں۔ایک حدیث میں نبی ﷺ نے قسمیہ قرآن کریم کے متعلق خبر گیری کی ترغیب فرمائی۔عن ابی موسیٰ الاشعریؓ قال رسول اللہ ﷺ تعاھدوا القرآن فو الذی نفسی بیدہ لھو اشد تفصیا من الابل فی عقلھا (بخاری ومسلم /بحوالہ مشکاۃ ۲۲۱۰) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہیکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا قرآن کریم کی خبر گیری کرتے رہا کرو اس ذات کی قسم جسکے قبضہ میں میری جان ہے قرآن سینوں سے اتنی جلدی نکل جاتا ہے کہ اونٹ بھی اتنی جلدی اپنی رسی سے نہیں نکلتا۔

ذکر کی مجلس:

جس کا دل ذکر کی مجلس میں بیٹھنے پر آمادہ ہو تو جان لو کہ اس آدمی کا دل زندہ ورنہ وہ دل مردہ ہے یاد رکھو، ایک حدیث میں ذاکرین کو زندہ اور نہ کرنے والوں کو مردہ بتایا گیا ہے، یعنی انکا دل ذکر نہ کرنے کی وجہ سے مردہ ہوگیا انکی روحانیت زندہ نہ رہی، عن ابی موسیٰ الاشعریؓ قال قال رسول اللہ ﷺ مثل الذی یذکر ربہ والذی لا یذکر مثل الحی والمیت.(بخاری ومسلم / بحوالہ مشکواۃ ۲۲۸۲۵) روح کی تازگی اور اسکے بقائے حیات کیلئے ذکر غذا کے مانند ہے ورنہ وہ قلب کا شمار مردوں میں ہوتا ہے، قرآن مجید میں سکون قلب کا سامان ذکر کو بتایا گیا ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (پارہ ۱۳) صاحب مظہری نے فرمایا ذکر سے مراد قرآن اور سکون سے مراد ایمان ہے (تفسیر مظہری) کیونکہ ایمان دلوں کا ذریعہ سکون اور نفاق دلوں کی بے چینی کا سبب ہے۔اللہ کی یاد سے شیطانی وساوس دور ہوتے ہیں جو انسان کیلئے پریشانی کا باعث ہیں۔ایک جگہ اللہ رب العزت نے ذکر کرنے والوں کو یہ خوشخبری دی ہے کہ جو مجھے یاد کرتا ہے اسے میں یاد کرتا ہوں فاذکرونی اذکرکم (پارہ ۲) مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے فرمایا ہیکہ بندہ اگر چاہے کہ اس کا تذکرہ اللہ کے یہاں ہو تو اس کو چاہئے وہ اللہ کے احکامات کو بجالائے کہ اس وقت میرا اللہ مجھ سے کیا چاہ رہا ہے، بزرگان دین نے اللہ کو یاد رکھنے کی آسان صورت یہ بتائی کہ آدمی جب اوپر چڑھے تو اللہ اکبر نیچے اترے تو سبحان اللہ اور جب برابر چلے تو لاالہ الااللہ کہنے اہتمام کرے۔حضرت عبد اللہ بن شقیقؒ سے مروی ہیکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر آدمی کے دل میں دو کوٹھریاں ہیں ایک میں فرشتہ اور دوسرے میں شیطان رہتا ہے، جب آدمی ذکر کرتا ہے تو شیطان ہٹ جاتا ہے، اور اگر غافل ہو تو وساوس ڈالتا ہے (تفسیر مظہری)

خلوت میں خدا کا خوف:

تیسری چیز دل کے زندہ اور مردہ ہونے کی جو بیان کی گئی ہے، وہ خلوت میں خدا کا خوف ہے، ایک طویل حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا سات ایسے آدمی ہیں جنکو اللہ قیامت میں اپنے عرش کے سایہ میں جگہ دے گا، جسکے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا، انمیں سے ایک وہ آدمی بھی ہے جو تنہائی میں اللہ کے خوف سے روتا ہو، سبعۃ یظلھم اللہ فی ظلہ، یوم لاظل الاظلہ، الخ ورجل ذکر اللہ خالیا ففاضت عیناہ (بخاری) آدمی کا تقویٰ تنہائی میں معلوم ہوتا ہے، جہاں اسکو کوئی نہ دیکھتا ہو اور نہ وہ کسی کو دیکھتا ہو ایسی جگہ پر اللہ سے ڈرے، نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا اتق اللہ حیثما کنت (ترمذی) تم جہاں کہیں بھی رہو اللہ سے ڈرو، جلوت میں ہو یا خلوت میں، عبادات ہو یا معاملات، غرض ہر موقع ومحل میں اللہ سے ڈرے کہیں ہم سے اسکی خطا نہ ہوجائے اور وہ ہم سے ناراض ہوجائے، قرآن مجید میں ایک مقام پر ارشاد باری ہے الا ھو معھم این ما کانوا ثم ینبئھم بما عملوا یوم القیامۃ (سورہ المجادلہ) اللہ فرماتا تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے، اور کل قیامت کو بتلائے گا

تمہارے کئے اعمال کو، اسی طرح دوسری جگہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو اسکو پانچ قسم کے انعامات سے نوازے گا پہلا انعام دنیا وآخرت کے مصائب ومشکلات سے نجات کا راستہ ہموار کریگا، دوسرا انعام یہ ہے کہ اسکو روزی ایسی جگہ سے دیگا جہاں سے اسکو گمان بھی نہ ہوگا، تیسرا انعام یہ ہیکہ اللہ اسکے کام کو آسان فرمائے گا، چوتھا انعام یہ ہیکہ اسکی سیئات کو مٹادے گا، پانچواں انعام یہ ہیکہ اسکے اجر کو بڑھادے گا۔ (سورہ تحریم) حقیقت یہ ہیکہ تنہائی کا گناہ آدمی خدا اس قدر دور کردیتے ہیں جس قدر تنہائی کی نیکی قریب کردیتی ہے۔ اللہ کے یہاں ساری نوع انسانیت برابر ہے کسی کی برتری اور کمتری نہیں ہے، ماخلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدہ اگر کوئی اللہ کو یہاں اپنا مقام بنانا چاہے تو تقویٰ اختیار کرے، اللہ ارشاد فرماتا ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقکم

۔جسکا راس المال تقویٰ ہو وہ اسقدر نفع میں ہے زبانیں اسکے ذکر سے عاجز ہے۔ حضرت وابصہؓ بن معبد سے مروی ہے کہ ایک آدمی آکر عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ نیکی اور برائی کیا ہے آقا ﷺ نے فرمایا جب تم نیکی یا بدی کرو تم اپنے دل کی کیفیت معلوم کرو اگر وہ مطمئن ہے تو ٹھیک ہے کہ وہ نیکی ہے اور اگر کچھ کھٹک ہوجائے تو سمجھو وہ بدی ہے۔ کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

واذا خلوت بریبة فی ظلمة والنفس داعیة الی الطغیان
فاستحی من نظر الاله وقل لها ان الذی خلق الظلام یرانی.

(جب تو کسی اندھیرے میں برائی کیلئے قدم اٹھائے، تیرے دل میں اس برائی کا داعیہ ہو، تو اس وقت تو اللہ کی نظر سے دیکھ اور کہہ اس سے، جس نے اندھیری پیدا کی وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

جامعة البنات الاصلاحیة حیدرآباد (ملک پیٹ)

لڑکیوں کی اعلیٰ دینی وعصری تعلیم کا فکری واصلاحی معیاری مرکز

شعبہ جات: تحفیظ القرآن الکریم ★ شعبہ ابتدائیہ (دوسال)
★ شعبہ عالمیت (چارسال) ★ شعبہ فضیلت (دوسال)

☆شہر سے اہم مقامات سے آمدورفت کی سہولت ☆دوردراز کی طالبات کے لیے ہاسٹل کا نظم ☆عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک تا ایم۔اے امتحانات دلوانے کا نظم

لڑکیوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ، ادب، سیرت، تاریخ کے علاوہ انگریزی زبان کے اعدادیہ تا فضیلت چھ سال تعلیم کا بہترین نظم ہے

رابطے کے لیے پتہ:
JAMIATUL BANAT AL-ISLAHIYAH
#16-3-993/1, NEAR DAWN HIGH SCOOL
OFFICERS COLONY, NEW MALAKPET,
HYDERABAD(T.S) INDIA 500036

نصب العین: انقلاب بذریعہ تعلیم قرآن وسنت کی گہری بصیرت، شہادت حق، احیائے دین کی استعداد اور امت کے لیے داعیانہ، مجاہدانہ اور قائدانہ کردار کی حامل "المرأة الصالحة" ٹیم کی تیاری۔
☆شعبہ تحفیظ القرآن اور شعبہ ابتدائیہ وعالمیت کے پہلے سال میں داخلے سال بھر جاری رہیں گے۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے خواہشمند سرپرست حضرات سے اپنی لڑکیوں کے ہمراہ جلد رجوع ہونے کی خواہش کی جاتی ہے۔

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد کا استحکام وقت کا اہم تقاضہ اور ملی فریضہ ہے۔ اس اہم مرکز کی تعمیر وترقی ک لیے مالی اور اخلاقی تعاون فرما کر ہمارے حوصلے کو قائم رکھیں۔

ناظم: مولانا عبدالعلیم اصلاحی
موبائل 9676202819

ڈراما ''علامہ'' تفہیم اقبالیات میں نیا اضافہ

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا، اس لئے مصنفین، مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دو عدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

ڈاکٹر جہاں نظیر (ہریانہ)

زیر نظر کتاب ڈراما ''علامہ'' علامہ اقبال کی زندگی کے اردگرد بنا صالحہ صدیقی کا لکھا ہوا بے حد خوبصورت ڈرامہ ہے، یہ ڈراما سات مناظر پر مشتمل ہیں۔ اس ڈرامے کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک سال کے مختصر وقفے کے بعد ہی دوسرے ایڈیشن کی ضرورت محسوس کی گئی جس کا ذکر مصنفہ نے اپنے پیش لفظ میں بھی کیا ہے۔ اس ڈرامے کا ہندی ترجمہ بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ پیش نظر ڈرامے کا دیباچہ عالمی شہرت یافتہ معروف افسانہ نگار مرزا حامد بیگ (لاہور، پاکستان) نے لکھا ہے، تو اس ڈرامے میں تقریظ ڈاکٹر طاہر حمید تنولی (لاہور، پاکستان) نے۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کی سوانح عمری بھی شامل ہے جس سے نئے پڑھنے والوں کو علامہ اقبال کو سمجھنے، جاننے اور ان کی شاعری سے واقفیت کا بھی موقع فراہم ہوتا ہے۔ اس ڈرامے میں مشاہر نقد و ادب کے نظریات بھی شامل ہیں۔ جس سے ڈرامے کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اس ڈرامے کے مطالعہ سے مصنفہ کی محنت اور تحقیقی کاوش کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ شاعر مشرق کی شاعری، فکر، فن، فلسفہ پر یوں تو بے شمار لکھا گیا ہیں اور ہر روز ایک نئے نکات پر خامہ فرسائی بھی کی جاتی ہے لیکن ان کی ازدواجی زندگی، ان کی ذاتی زندگی، ان کی شخصیت، ان کے درد و کرب پر ڈراما لکھنا واقعی قابل تعریف ہے۔ بقول پیغام آفاقی:

''علامہ اقبال کی زندگی پر مبنی میری نظر میں یہ پہلا ڈرامہ ہے، جسے صالحہ صدیقی نے بڑی خوبصورتی سے قلمبند کیا ہے۔ اس ڈرامے میں علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی کو مرکز بنایا گیا ہے جس پر عموماً کم ہی گفتگو کی جاتی ہے۔ ڈرامے کے مطالعے سے اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ صالحہ صدیقی ڈرامے کے فنی لوازمات، حسن اور

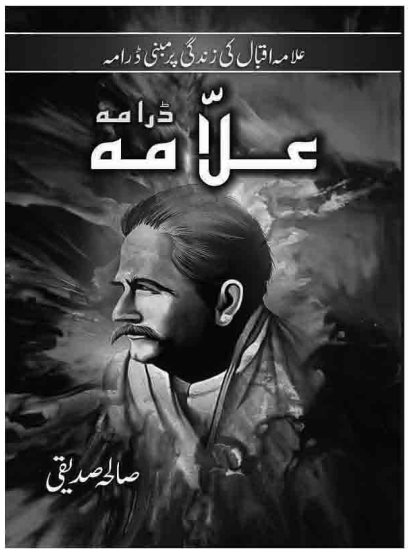

اس کے تقاضوں کو بخوبی سمجھتی ہے۔ علامہ اقبال کی زندگی کو ڈرامے کی صورت میں پیش کرنے کی جرأت واقعی قابل تعریف ہے۔ میں صالحہ صدیقی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید بھی کہ یہ ڈرامہ از جلد اسٹیج پر بھی پیش کیا جائے گا (اسی کتاب سے، ص 103)

ڈراما ''علامہ'' لکھنے کے اسباب پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں کہ:

''شاعر مشرق علامہ اقبال کی نظموں کو پڑھ کر ان کی زندگی کو قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ مجھے ان کی نظموں کے ذریعے ان کی شاعری میں ان کا درد، ان کی حب الوطنی اور ان کی زندگی کے اتار چڑھاؤ خصوصاً اسلام کا نشاۃ الثانیہ سمجھنے کا موقع ملا۔ ان کی نظموں کو پڑھنے کے بعد اس عظیم شاعر کی زندگی کے کچھ پوشیدہ حصوں کو میں نے ڈرامے کی شکل دی ہے۔ اس ڈرامے میں پیش کئے گئے واقعات خیالی نہیں بلکہ تاریخی حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس ڈرامے میں پیش کردہ واقعات کا ذکر اقبالیات کے ماہرین اور دیگر مستند اہل قلم نے بھی کیا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی زندگی میں تین شادیاں کیں، ان کی ازدواجی زندگی پہلی شادی سے ہی ایک ڈرامائی صورت اختیار کرنے لگی تھی۔ شادی ایک انسان کی زندگی کا اہم جزو

ہے جس کو لے کر ہر انسان کے کچھ خواب، کچھ امیدیں اور انوکھے جذبات و احساسات وابستہ ہوتے ہیں یہ ایک انسان کی فطری نفسیات میں شامل عمل ہے ،اپنے ہم سفر کے ساتھ ساتھ سفر طے کرنے کے لئے وہ راستے میں آنے والے تمام مصائب کا سامنا بھی وہ اپنے ہم سفر کے ساتھ طے کرنے کی خواہش کرتا ہے،لیکن جب شادی کے بعد امیدیں ٹوٹتی ہیں تو جیسے زندگی کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے اور ایک ایک کر کے سارے خواب ٹوٹ کے ریزہ ریزہ ہونے لگتے ہیں ۔علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی کے بھی ان کی شاعری کی طرح بے شمار پہلو تھے۔ان کی شادی شدہ زندگی کے تانے بانے میں بے شمار جہتیں تھیں جن کی طرف کم توجہ دی گئی ہے۔یوں تو شاعر مشرق کی زندگی سے وابستہ ہر ایک چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی باتوں پر باریک بینی سے تفصیلی ذکر اور بحث ومباحثہ کیا گیا ہے ۔آپ کی حیات وخدمات پر ہندستان، پاکستان میں ہی نہیں دنیا کے کئی ممالک کی بیشتر زبانوں میں لاتعداد کام کیا گیا ہے۔آپ کی ازدواجی زندگی پر بھی گفتگو ملتی ہے لیکن ان کی زندگی کے اس اہم پہلو کو اس طرح منظر عام پر آج تک نہیں لایا گیا جیسا ایک شوہر اپنی بیوی کے متعلق سوچتا ہے ،اس سے امیدیں رکھتا ہے، بیوی کے موجود ہوتے ہوئے بھی اس کی کمی محسوس ہونے پر دل و دماغ پر ہونے والے اثرات، کیفیات ،تنہائی کا احساس درد، چبھن اور ٹیس علامہ اقبال بلاشبہ ایک عظیم شخصیت اور خداداد صلاحیتوں کے حامل ایک لافانی شاعر تھے ۔لیکن بالآخر وہ ایک انسان بھی تھے جن کے سینے میں دل دھڑکتا تھا،جن کی اپنی ایک زندگی تھی،اور اس زندگی کے سفر کو طے کرنے کے لیے ایک مخلص ،ایک ہمدرد،ایک دوست ایک ساتھی ، ایک غمگسار کی ضرورت تھی جو ان کے دل میں اٹھتے پوشیدہ جذبات کو سمجھ سکے ،ان کے احساسات کو محسوس کر سکے، ان کے اس درد کو اپنے اندرون میں جذب کر سکے جسے وہ دنیا میں کسی کے ساتھ بھی نہ بانٹ سکتے ہوں.....ناپڑا۔

علامہ اقبال کی زندگی کے اسی رخ کو اس ڈرامہ ''علامہ'' میں پیش کیا گیا ہے۔ جہاں ایک طرف وہ شہرت و بلندی کے آسمان کو چھو رہے تھے آپ پر انعامات واعزازات کی بارش ہو رہی تھی تو دوسری طرف ان کی ذاتی زندگی کشمش و تصادم میں مبتلا تھی ایک خاموشی سی چھائی ہوئی تھی ۔ان کے اسی جذبات و احساسات کی عکاسی اس ڈرامہ کے ذریعے کرنے کی سعی کی گئی ہے۔''

اسی طرح اس ڈرامے کے سلسلے میں حقانی القاسمی (ساہتیہ اکیڈمی انعام یافتہ) نے اس ڈرامے کے متعلق لکھا ہے کہ:''صالحہ صدیقی نے ڈرامہ کے فنی لوازمات کا خیال رکھتے ہوئے ایک ایسے موضوع پر ڈرامہ لکھا ہے جس پر اس سے پہلے کوئی ڈرامہ تخلیق یا تشکیل نہیں دیا گیا۔ایک نئی جہت کی جستجو،صالحہ کی ذکاوت طبع کی دلیل ہے۔''

اس ڈرامے کی ابتدا علامہ اقبال کی پہلی شادی کی کشمکش و تصادم سے ہوتی ہے۔پھر ان کی دوسری اور تیسری شادی کی کشمکش کو بھی اس ڈرامے میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔اس ڈرامے میں علامہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات کو بھی پیش کیا گیا ہیں اس ڈرامے کی خاص بات مجھے جو اس ڈرامے سے جوڑے رکھی وہ یہ کہ اس میں پیش کردہ مناظر،زبان ،عہد و ماحول ،رہن سہن ،کھانا پینا ،اٹھنا بیٹھنا،تہذیب وثقافت، سبھی کچھ اسی زمانے کے مطابق پیش کیا گیا ہیں جس سے ہمیں اس عہد کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آنے لگتی ہیں۔ ڈرامے کے مطالعے کے وقت پیش کردہ واقعات بھی ایسے ہیں کہ ہم خود کو بھی اسی زمانے میں محسوس کرنے لگتے ہیں ۔بقول ڈاکٹر احمد صغیر ''ڈرامہ ''علامہ'' میں اقبال کی ازدواجی زندگی کے نشیب وفراز کو بیحد فنی چابکدستی سے ڈرامے کے سانچے میں صالحہ صدیقی نے ڈھالا ہے ۔ڈرامہ کی واقعات نگاری بے حد متوازن اور نپی تلی ہے۔واقعہ نگاری میں زندگی کی عکاسی ہے سادگی اور بے تکلفی کے عنصر نے ڈرامے میں جان ڈال دی ہے مکالمے مختصر اور پر اثر ہیں ۔اس طرح یہ ڈرامہ یقیناً علامہ اقبال کی شخصیت کے اچھوتے پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔صالحہ صدیقی مبارکباد کی مستحق ہیں کہ ڈرامہ ''علامہ'' لکھ کر ڈرامے کے باب میں ایک نیا اضافہ کیا ہے۔''(اسی ڈرامے سے،ص108)

علامہ اقبال اور ان کی پہلی شریک حیات کریم بی بی کے درمیان کریم بی بی کے زریعہ کہا گیا یہ مکالمہ جس سے مصنفہ کی منظر نگاری اور شوہر

اور بیوی کے ٹوٹتے رشتے کی کشمکش کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہیں ملاحظہ فرمائیں:

''یہ گھٹن بھری زندگی اب مجھ سے برداشت نہیں ہورہی ہے ۔چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے پریشان ہونا ،دھوئیں سے بھرا ہوا باورچی خانہ ،ساتھ میں اپنی ادبی زندگی میں کھوئے میرے میاں جنہیں نہ دن کا ہوش رہتا ہے اور نہ ہی رات کی خبر.... جب دیکھو اپنی شاعری میں مگن رہتے ہیں ،نظموں اور غزلوں میں کھوئے رہتے ہیں....'' (اسی ڈرامے سے)

اسی طرح کریم بی بی کے مانکے چلے جانے کے بعد تنہائی میں علامہ اقبال کا درد جسے مصنفہ نے بڑی خوبصورتی سے لفظوں کے سانچے میں ڈھالا ہیں ملاحظہ فرمائیں:

''مٹھی بھر ریت بٹوری تھی میں نے...سوچا تھا! میری مٹھی میں اجلے ، چمکیلے، روشن جگنو قید ہیں...انگلیوں کے پوروں سے جانے کب پھسل گئی وہ ریت ۔۔۔ پتہ ہی نہ چلا...جب مٹھی کھولی تو کچھ بھی نہیں تھا...'' (اسی ڈرامے سے)

اس طرح کے بے شمار مناظر اس ڈرامے میں پیش کے گئے ہیں ۔اس ڈرامے کے مطالعے کے بعد اس کے تسلسل ،روانگی ،زبان ،بیان ،مناظر ،کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ڈاکٹر صالحہ صدیقی کی اس کاوش کے لیے انھیں مبارکباد پیش کرتی ہوں ۔ڈاکٹر صالحہ صدیقی ایک فعال قلم کار ہے، (بقیہ ص:۳۶ر پر)

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

Consultation Time
Morning 9:00 am to 3:00 pm
(Friday closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowki Hyderabad - 500008 T.S India

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم (اقامتی وغیر اقامتی ادارہ)

شاہی ہلز شاہین نگر حیدر آباد

زیر انتظام : شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدر آباد

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
Ac N: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBkL0001327. Branch: Charminar Hyderabad (T.S)

بانی وناظم :مولانا ڈاکٹر مفتی محمد محامد ہلال اعظمی ۔موبائل:9392533661